مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

مدیر مسئول
شرف علی تھانوی

ماہنامہ الامداد
لاہور پاکستان

مدیر
خلیل احمد تھانوی

جلد ۲	ربیع الاول ۱۴۲۲ھ / جون ۲۰۰۱ء	شمارہ ۷

رأس الاربعین

ازافادات: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عنوانات وحواشی: مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۱۰ روپیہ — زرسالانہ =/۱۰۰ روپے

پتہ دفتر۔ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون نمبر ۴۴۸۰۶۰
۵۴۲۲۲۱۳
ماہنامہ الامداد

ناشر: مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اربی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

ماہ ربیع الاول وربیع الثانی کے متعلق یہ وعظ بروز جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ جو ۲ گھنٹہ ۴۰ منٹ میں ختم ہوا، حاضری قریباً ۱۰۰ کی تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ ملقب بہ

رأس الربیعین

(ربیع الاول اور ربیع الثانی کے احکام)

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلّم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ویوم تقوم الساعۃ یومئذ یتفرقون ☆ فاما الذین امنوا و عملوا الصلحت فھم فی روضۃ یحبرون ☆ واما الذین کفروا وکذبوا بایتنا فاولئك فی العذاب محضرون ☆۔(۱)

تمہید

یہ آیتیں جو میں نے پڑھیں ہیں ان میں الفاظ کا مدلول تو صرف اعمال صالحہ

(۱) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز سب لوگ جدا جدا ہو جاویں گے۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کیے تھے وہ تو باغ میں مسرور ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ سورۃ الروم آیت ۱۴-۱۶

وعقائد صالحہ کا ثمرہ ثواب جنت ہونا اور اعمال غیر صالحہ وعقائد باطلہ کا ثمرہ عذاب جہنم ہونا ہے(۱)۔ اور عجب نہیں(۲) کہ سننے والے اس ظاہری مدلول(۳) سے یہی سمجھے ہوں گے کہ اس وقت مقصود اعمال صالحہ کی ترغیب اور اعمال غیر صالحہ سے ترہیب(۴) کا بیان کرنا ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے مگر مجھے اس وقت اس پر اکتفا کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور دوسری باتیں اور بعضے خاص مسائل بھی بیان کرنا مدنظر(۵) ہیں جن کی وجہ خصوصیت ایام ہے۔

یہ بات اکثر احباب کو معلوم ہے کہ ان ہی ایام ربیع الاول سے پہلے اور کبھی خاص اسی مہینے میں چند سالوں سے میرا معمول ہوگیا ہے کہ اعمال وعقائد کی بابت(۶) کچھ بیان کرتا ہوں جو ان ایام(۷) میں اکثر لوگ آجکل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد میں چند وعظ ''النور'' یا ''الظہور'' وغیرہ شائع بھی ہو چکے ہیں۔ پارسال(۸) بھی ایک مضمون ''السرور'' کے نام سے بیان ہوا تھا، اس وقت آئندہ سال کیلئے یہ نیت تھی کہ اس مضمون کو بعنوان دیگر(۹) بیان کردیا جاوے گا مگر بزرگوں کا مقولہ ہے کہ عرفت ربی بفسخ العزائم(۱۰)۔

یہ نیت بعد میں بدل گئی چونکہ مضامین جدیدہ(۱۱) ذہن میں تھے نہیں اور اعادہ(۱۲) کو جی نہ چاہا اسلیئے ارادہ امسال فسخ(۱۳) ہو چکا تھا۔ چنانچہ مہینہ ختم ہونے کو بھی

---

(۱) تلاوت کردہ آیات کے الفاظ تو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اچھے اعمال اور صحیح عقائد کا نتیجہ تو ثواب اور جنت ہے اور برے اعمال اور غلط عقائد کا نتیجہ عذاب دوزخ ہے (۲) اس میں بھی تعجب نہیں (۳) الفاظ قرآن کی ظاہری دلالت کی وجہ سے (۴) اچھے اعمال کا شوق دلانا اور برے اعمال سے روکنا (۵) پیش نظر ہے (۶) متعلق (۷) دنوں میں (۸) پچھلے سال (۹) ایک دوسرے عنوان سے (۱۰) میں نے اپنے ارادوں کے توڑنے سے اپنے رب کو پہچانا (۱۱) نئے مضامین (۱۲) دوبارہ انہی مضامین کو بیان کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوا (۱۳) اس لئے اسی سال ارادہ بیان کا نہیں تھا۔

آ گیا اور اب تک اسی لئے کہ مضمون جدید ذہن میں نہ تھا کوئی بیان ان امور مروجہ (۱) کے متعلق نہیں ہوا۔ مگر حق تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس ارادہ کا پھر وہی حشر ہوا۔ چونکہ وہ ارادہ پہلے موجود ہوا تھا پھر فنا ہو گیا۔ پھر اب موجود ہے اس لئے یہ گویا اس کا حشر ہوا (۲)۔ حشر کے معنی ہیں مردہ کا زندہ ہو جانا یہ مضمون اگرچہ پہلے ہفتہ میں ذہن میں آ چکا تھا مگر اس وقت ایک دوسرے مضمون کو مقدم (۳) کرنا مناسب معلوم ہوا۔

وہ یہ کہ اس وقت قحط سالی کی عام طور پر شکایت ہو رہی ہے تو اس میں بتلایا گیا تھا کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ جس طرح اس ارض ظاہری کی حیات (۴) کا سبب بیان کیا گیا ہے تو ارض باطنی جو کہ قلب (۵) ہے اس کی حیات کا طریقہ اور راز بھی کیوں نہ بیان کیا جائے؟ ان دونوں مضمونوں کو پہلے ہفتہ میں الگ الگ بیان کر کے مجموعہ کا نام راس الربیعین (۶) رکھ دیا گیا اور چونکہ وہ دونوں مضمون الگ الگ طور پر مستقل تھے اس لئے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ لقب (۷) حیات الجدوب و حیات القلوب بھی مقرر کر دیا۔ لفظ جدوب کے معنی میں نے لغت میں تلاش کیے تو جدب کی جمع معلوم ہوئی جس کے معنی قحط کے ہیں جیسے کہ قلوب قلب کی جمع ہے۔

اب چونکہ وہ مضمون جس کا مقدم کرنا مناسب تھا بیان ہو چکا تو اس ہفتہ میں اس معمول کو پورا کرنے کا خیال پیدا ہوا کیونکہ مانع بھی مرتفع (۸) ہو گیا اس لئے اس سال بھی اس معمول کو پورا کیا گیا اور اس کا نام پارسال (۹) ہی ذہن میں ''الحبور'' آ چکا تھا۔

(۱) جو کام اس زمانہ میں رائج ہیں ان کے متعلق بیان نہیں ہوا (۲) ارادہ پہلے موجود تھا پھر ختم ہوا پھر دوبارہ موجود ہوا تو گویا یہ دوبارہ زندہ ہونا ہوا (۳) پہلے بیان کرنا (۴) ظاہری زمین کی زندگی کا سبب (۵) دل (۶) دو بہاروں کی بنیاد (۷) ہر بیان کا نام الگ الگ تجویز کیا یا ایک کا نام حیات الجدوب دوسرے کا نام حیات القلوب (۸) رکاوٹ دور ہو گئی (۹) گذشتہ سال

اس میں یہ بیان کیا جاوے گیا کہ ایمان اور اعمال صالحہ آپ کی بعثت کی اصل غایت(۱) ہے، جس کا ثمرہ جنت کی راحت ہے۔ لہذا حضورﷺ کی بعث قابل فرح(۲) دراصل اس لئے ہے کہ آپ کی بدولت (۳) اعمال صالحہ اور ایمان کی نعمت ہم کو نصیب ہوئی۔ یہ مضمون تو گذشتہ مضامین کی مانند ہے جو آیت کے دو جملوں سے سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اگرچہ اس کی تفصیل بہت کچھ کی جاسکتی ہے مگر اس وقت کا بیان زیادہ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ایک دوسرا مضمون بھی ذہن میں آگیا، جو زیادہ تر اس وعظ میں مذکور ہوگا اور پہلا مضمون بقدر ضرورت و اختصار ذکر ہوگا۔ زیادہ حصہ دوسرے ہی مضمون کا ہوگا اور وہ مضمون ہر سال ذہن میں آتا تھا مگر بیان سے رہ جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ بعد وقت گزر جانے کے اسکا خیال آتا تھا اب بھی وہ مضمون وقت کے بعد ہی ذہن میں آیا کیونکہ مہینہ بالکل قریب ختم آگیا ہے اور اس ضرورت کا موقع اوائل ماہ(۴) ہے۔ مگر اس سال پھر بھی اس کو بیان کرنا ضروری معلوم ہوا تا کہ رہ نہ جاوے اور آیندہ ایسے ہی موقع پر کام آوے۔

تعین مضمون

وہ مضمون تبرکات کا ہے جس کو حضورﷺ کی ذات سے اس لئے تعلق ظاہر ہے کہ آپ تمام تبرکات کے سردار اور سب کی اصل ہیں اور اسی لئے اس وقت صرف ان ہی تبرکات کا بیان نہ ہوگا جن کو حضور کی ذات سے تعلق ہے بلکہ عموماً تمام تبرکات کے متعلق بیان کیا جاوے گا۔ خواہ وہ تبرکات انبیاءؑ کے ہوں یا تبرکات اولیاءؒ کے۔

خصوصیت وقت و مقام یہ ہے کہ ہمارے قصبہ کے قریب بھی ایک تبرک

(۱) اصلی مقصد (۲) حضور کی بعثت خوشی کے لائق اس لئے ہے (۳) آپ کی وجہ سے (۴) مہینہ کے ابتدائی ایام

موجود ہے اور وہ جُبہ ہے رسول اللہ ﷺ کا، جس کی سند مثل احادیث کے تو متصل(۱) نہیں ہے مگر ہمارے بزرگوں نے اس کا انکار نہیں کیا اور جی کو بھی یہ بات لگتی(۲) ہے کہ وہ صحیح ہے اور اس کی زیارت اسی ماہ ربیع الاول میں ہوتی ہے۔ اس لئے اس ماہ سے بھی اس مضمون کو تعلق ہے، مگر چونکہ ہم لوگ عرس وغیرہ کرتے نہیں، اس لئے مثل اہل عرس کے کبھی وقت پر یہ مضمون خیال میں نہیں آتا۔

کیونکہ آجکل ایک جماعت درویشوں کی ہے جو صرف عرسوں ہی میں شریک ہونے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ جس وقت دیکھئے ان کا بستر کسی نہ کسی عرس کیلئے بندھا رہتا ہے۔ اور یہ ان کے نزدیک بڑا سرمایہ آخرت ہے۔ یہ اللہ کے بندے گھبراتے بھی نہیں۔ نہ معلوم روز کے روز ان سے سفر کیسے ہوتا ہے؟ ہمیں تو ذرا سے دور کے سفر سے بھی پریشانی ہوتی ہے۔ اب یا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ لوگ بڑے باہمت ہیں اور ہم لوگ کم ہمت ہیں یا یہ کہ وہ لوگ نکمے ہیں اور ہم لوگ کام کے ہیں۔ خیر وہ اپنے آپ کو باہمت سمجھتے رہیں اور ہم لوگ اپنے کو باکار(۳) سمجھتے رہیں۔ غرض ایسے لوگوں کو عرسوں کی تاریخیں خوب یاد رہتیں ہیں مگر ہم لوگوں کو اس واسطے یاد نہیں رہتیں کہ اس کا ہمارے یہاں کسی قسم کا چرچا نہیں ہوتا۔ نیز زیادہ چرچا ان باتوں کا بچوں میں بھی ہوا کرتا ہے، ہمارے یہاں ان باتوں کیلئے مدرسہ میں بچوں کو تعطیل(۴) ہی نہیں ہوتی اور نہ طلباء کو اس میں شریک ہونے کی اجازت ہے بلکہ سخت ممانعت

(۱) احادیث میں سند اس کو کہتے ہیں کہ حدیث بیان کرنے والا یہ بیان کرے کہ یہ حدیث اس سے کس نے بیان کی ہے اپنے سے لے کر نبی ﷺ تک جتنے واسطے درمیان میں ہوں سب کو ذکر کرے اس کو سند متصل کہتے ہیں اس جُبہ مبارکہ کے بارے میں ایسی مسلسل سند تو نہیں ہے (۲) دل بھی اس بات کو قبول کرتا ہے (۳) کام میں مشغول (۴) چھٹی۔

ہے۔

ان وجوہ سے اس مرتبہ بھی یہ مضمون وقت پر ذہن میں نہیں آیا بلکہ اس وقت اس کا خیال آیا مگر احکام شرعیہ کے لئے وقت ہی کیا؟ جب یاد آجاوے وہی وقت ہے۔ اور چونکہ یہ مضمون اخیر وقت میں ذہن میں آیا اس لئے ایک دوسرا مضمون بھی اس کے ساتھ بیان کرنا مناسب ہوگیا۔ یہ دن چونکہ ربیع الاول و ربیع الثانی کے وسط(۱) میں ہے کہ یا تو آج ربیع الاول کی ۳۰ تاریخ ہے یا ربیع الثانی کی پہلی ہے۔ اسلئے ربیع الثانی کے متعلق گیارہویں کا مضمون بھی ذہن میں آگیا۔

تو اب اس وعظ کے بھی دو جزو ہوجائیں گے ایک جزو جناب رسول اللہ ﷺ کے جُبہ مبارک کے متعلق جو کہ اصل ہے، اور دوسرا گیارھویں اور تبرکات کے متعلق یہ سب مضامین الگ الگ بیان کروں گا۔ ہر چند کہ ان تینوں جزوؤں کے متعلق جو مضمون ہے۔ اس کیلئے ایک حدیث ذہن میں ہے جس کا تعلق اس مضمون سے بے تکلف واضح طور پر ہے اور سارا بیان قریب قریب اسی حدیث پر متفرع(۲) ہوگا۔ چونکہ آیت شریفہ اول ذہن میں آچکی تھی۔ اس لئے اس کے چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ نیز وہ حدیث اس آیت کی شرح ہے۔ اس لئے آیت کو حدیث کا اصل قرار دیا گیا اور حدیث کو تمام وعظ کی اصل۔ پس حدیث آیت پر متفرع ہے اور وعظ حدیث کی فرع(۳) ہے۔ اس طرح اس بیان کو حدیث اور آیت دونوں سے تعلق ہوگا۔

---

(۱) ج میں (۲) سارا مضمون اسی حدیث سے اخذ کر کے بیان کیا جائے گا (۳) آیت کی شرح حدیث اور حدیث کی شرح یہ وعظ ہے۔

اللہ تعالیٰ غصہ سے مغلوب نہیں ہوتے

اول آپ آیت کا مطلب سنیے۔حق تعالیٰ شانہ اس مقام پر قیامت کا ذکر فرمارہے ہیں۔

ویوم تقوم الساعة یبلس المجرمون ☆ ولم یکن لهم من شرکائهم شفعاء وکانوا بشرکائهم کفرین ☆ ویوم تقوم الساعة یومئذ یتفرقون ☆(۱)

جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن مجرم ناامید ہوں گے۔ پھر اس آیت کے بعد یوم تقوم الساعة کا اعادہ فرماتے ہیں ویوم تقوم الساعة یومئذ یتفرقون جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔اس لفظ کے اعادہ میں نکتہ زیادت تہویل ہے(۲)۔ چنانچہ اردو محاورہ میں بھی ایسے موقع پر اسی طرح کلام کیا جاتا ہے کہ فلاں روز یوں واقعہ ہوا۔اس روز اس طرح حادثہ پیش آیا۔ اس روز کے لفظ کو بار بار اعادہ کرتے ہیں۔

نیز اس طرز کلام سے حق تعالیٰ شانہ کی رحمت صاف صاف ٹپکتی ہے کہ جس روز کیساتھ قیامت کے متعلق کفار کا حال ابلاس(۳) بیان فرمایا، عین اسی بیان ابلاس(۴) میں جو کہ ظاہراً اس کے مقابل کی طرف توجہ کے ضعف کا سبب متوہم ہوتا تھا اسی روز کے ساتھ مومنوں کی حالت بھی بیان فرمائی۔اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت لوگ رحمت

---

(۱) سورۃ الروم آیت ۱۲ تا ۱۴ (۲) قیامت کے وقوع کا بار بار ذکر کرنے سے مقصد اہمیت اور خوف دلانا ہے (۳) اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کی حالت کو بیان کیا (۴) اسی مایوسی کے بیان کی حالت میں یہ خیال ہوتا تھا کہ جو لوگ ان کفار کے مقابل یعنی مومن ہوں گے ان کی طرف اللہ کی رحمت متوجہ نہ ہوگی اس لئے مسلمانوں کا حال ذکر کیا۔

خداوندی سے مایوس ہو جاتے کیونکہ جن کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام کا فہم اور اثر(۱) عطا فرمایا ہے جب وہ نہایت بلاغت وفصاحت اور شد و مد(۲) کیساتھ یہ مضامین وعید و تہدید(۳) کے کفار کی بابت سنتے تو ان پر غلبہ خوف کی وجہ سے وہی حالت طاری ہو جاتی جو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کے اثر میں بیان فرمائی ہے۔

لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته خاشعا متصدعا من خشية الله(۴)

کہ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو اللہ کے خوف سے پست اور پھٹنے والا دیکھتے۔ اگر قرآن میں وعید کے ساتھ ساتھ بشارت(۵) نہ ہوتی تو بہت سے قلوب مارے خوف کے شکستہ(۶) ہو جاتے۔

سو اس طرز سے حق تعالیٰ شانہ نے یہ ظاہر فرما دیا کہ ہم کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو کہ غصہ کے وقت رحمت نہ ہو سکے جیسا کہ انسان اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غصہ کے وقت اگر کوئی دوست سامنے آجائے تو اس سے بھی اسی سختی کے لہجہ میں گفتگو کی جاتی ہے۔ انسان سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ عین شدت غضب(۷) میں اگر کوئی دوست سامنے آجائے تو لہجہ بالکل بدل جائے اور دل میں سکون ہو جائے۔ چہرہ کی حالت بالکل بدل جائے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اوپر جب کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو ہم اس سے مغلوب(۸) ہو جاتے ہیں۔ اگر اس وقت دوسری حالت کے اسباب پیدا

---

(۱) جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سمجھ اور اس سے متاثر ہونے کی قوت عطا فرمائی ہے (۲) اہتمام کے ساتھ (۳) دھمکی آمیز مضامین (۴) سورۃ الحشر آیت ۲۱ (۵) دھمکی کے ساتھ خوشخبری کے مضامین نہ ہوتے (۶) دل ٹوٹ جاتے (۷) سخت غصہ کی حالت میں (۸) متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہو بھی جائیں تو دفعۃً حالت کا بدلنا قریب محال(۱) ہے۔ تو شاید کوئی شخص آیات وعید کو شد و مد(۲) کیساتھ قرآن میں دیکھ کر خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگتا ہے کہ ایسے غصہ کے وقت اگر کسی کو مطیع بندے کا خیال آ گیا تو کہیں اس پر بھی سختی نہ ہونے لگے کیونکہ لوگوں نے ہمیشہ حق تعالیٰ شانہ کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے۔

آیت کا شان نزول

چنانچہ حدیث شریف میں تین شخصوں کا واقعہ آتا ہے کہ وہ تینوں اس بات میں مشورہ کرنے بیٹھے کہ حق تعالیٰ ہماری باتوں کو سنتے ہیں یا نہیں؟ ایک صاحب بولے کہ جب ہم زور سے بولتے ہیں تو سنتے ہیں آہستہ بولتے ہیں تو نہیں سنتے۔ دوسرے صاحب بولے کہ نہ زور سے بولنے میں سنتے ہیں اور نہ آہستہ بولنے میں۔ یہ سمجھے کہ جس قدر بعد(۳) ہے اس نسبت سے آواز بلند نہیں ہے۔ تیسرے صاحب بولے جو ان میں ذرا عقلمند اور بوجھ بجھکوے(۴) تھے کہ اگر سنتے ہیں تو ہر طرح کی بات سنتے ہیں آہستہ کی بھی اور زور کی بھی اور جو نہیں سنتے تو کوئی سی بھی نہیں سنتے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ ہم سے اس قدر دور ہیں کہ اتنی دوری میں زور کی آواز بھی آہستہ ہی کے حکم میں ہے۔ چنانچہ ہم یہاں بیٹھے ہوئے کس قدر آواز سے باتیں کرتے ہیں مگر جو لوگ دور ہیں جیسے کلکتہ والے وہ ہماری آواز کو نہیں سن سکتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وما کنتم تستترون ان یشهد علیکم سمعکم ولا ابصارکم ولا جلودکم ولکن ظننتم ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون ☆

(۱) تقریباً ناممکن ہے (۲) دھمکی آمیز آیات کو اس اہتمام سے قرآن میں دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کر لینا (۳) جس قدر دوری ہے (۴) تھوڑی بہت عقل والے۔

وذالکم ظنکم الذی ظننتم بربکم ارداکم فاصبحتم من الخسرین ☆(۱)۔

اس ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون پر ایک قصہ یاد آیا۔ منگور میں ایک حافظ صاحب نے یہ آیت نماز میں پڑھی ولکن ظننتم ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون۔ ان کے پیچھے ایک نیم مُلّا بھی تھے انہوں نے حافظ صاحب کو لقمہ دیا ان اللہ یعلم کثیرا مما تعملون۔ حافظ صاحب نے پھر آیت کا اعادہ کیا چونکہ ان کو اچھی طرح لا یعلم کثیرا مما تعملون یاد تھا۔ انہوں نے پھر یہی پڑھا۔ اور ان مولوی صاحب کے لقمہ کی پرواہ نہ کی بعد نماز کے مولوی صاحب نے حافظ صاحب سے سخت لہجہ میں کہا کہ ہم نے تم کو لقمہ (۲) دیا تم نے لیا کیوں نہیں؟ سب کی نماز خراب کی۔ حافظ صاحب کو چونکہ خوب یاد تھا اس لئے صاف کہہ دیا کہ قرآن میں لا یعلم ہی ہے دیکھ لیا جاوے۔ قرآن کو دیکھا تو واقعی اس میں بھی لا یعلم نکلا۔ اب تو مولوی صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے ان اللہ لا یعلم کیونکہ اللہ تعالی کا عدم علم (۳) تو محال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے غلطی ہوگئی۔ ایک عالم بھی وہاں موجود تھے انہوں نے سمجھایا کہ ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون ہی صحیح ہے۔ اور یہ تو ظن (۴) کفار کا معمول ہے کہ تم یوں گمان کرتے ہو کہ خدا کو ہمارے بہت

---

(۱) اور تم اس بات سے تو اپنے کو چھپا ہی نہیں سکتے تھے کہ تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں تمہارے خلاف گواہی دیں گی۔ لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالی کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر بھی نہیں۔ اور تمہارے اس گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا پھر تم خسارہ میں پڑ گئے۔ سورۃ حم سجدہ آیت ۲۳۔۲۴ (۲) دوران نماز امام کو اسکی تلاوت کی غلطی درست کرنے کیلئے صحیح آیت تلاوت کر کے بتانے کو لقمہ دینا کہتے ہیں (۳) اس لئے کہ ان اللہ لا یعلم کا مطلب ہے کہ اللہ نہیں جانتے اور یہ بات تو ناممکن ہے (۴) کفار کا یہ خیال ہے۔

سے اعمال کی بھی خبر نہیں تو ان اللہ لا یعلم ۔ ظننتم کے تحت میں داخل(۱) ہے جب ان نیم ملا صاحب کی حیرت ختم ہوئی اور سمجھے کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی کہ ظننتم پر خیال نہ کیا۔

دوسرے اس بھلے مانس کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ ان اللہ یعلم کثیرا مما تعملون میں کثیرا کی قید کے کیا معنی ہوں گے؟ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت اعمال کو جانتے ہیں یعنی سب کو نہیں جانتے۔ مگر خیر چونکہ بیچارے کسی قدر ذی علم تھے اس لئے تنبیہ سے سمجھ گئے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ نیم ملا(۲) ہونا تو برا ہے پھر اسے اچھا کیوں کہا گیا کہ ذی علم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیم ملا ہونا اس وقت برا ہے جبکہ وہ اپنے کو مستقل سمجھے اور جو نیم ملا محقق کا تابع ہو کر رہے تو ایسا نیم ملا تو اچھا ہے۔ یہ ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون کے متعلق ایک لطیفہ تھا۔

اللہ کے بارے میں غلط قیاسات

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں چنانچہ ایک واقعہ تو حدیث کا بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ مرض لوگوں میں قدیم ہے۔ آجکل بھی ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ خود ہمارے اسی قصبہ میں ہمارے محلہ کی ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئیں۔ اب تو اس بیچاری کا انتقال ہو چکا مگر ان کی اولاد موجود ہے آکر کہنے لگی کہ مولوی جی! میں پوچھوں کہ اللہ میاں زندہ ہیں؟ ان کی اس بات پر گھر میں جو مستورات تھیں سب ہنسنے لگیں۔ میں نے منع کیا کہ ہنسو مت! اس کو اس کی فہم(۳) کے مطابق جواب دو تا کہ یہ سمجھ جائے۔ غنیمت ہوا کہ اس نے یہ اعتقاد نہیں کیا تھا کہ معاذ اللہ حق

(۱) ان اللہ لا یعلم کا تعلق آیت میں مذکور لفظ ظننتم سے ہے اب مطلب ہے کہ تمہارا خیال یہ ہے کہ اللہ نہیں جانتے (۲) نیم ملا اس کو کہتے ہیں جس کو علم کا پورا نہ ہو اور اپنے کو عالم سمجھے (۳) سمجھ

تعالیٰ زندہ نہیں، بلکہ کم فہمی(۱) کی وجہ سے تردد(۲) ہی میں رہی۔ میں نے اس کی سمجھ کے موافق(۳) اس سے کلام(۴) کیا اور یہ پوچھا کہ بڑی بی آخر تم دیکھتی کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں مرتے ہیں، دنیا میں اولاد ہوتی ہے تو یہ کام کون کرتا ہے؟ کہنے لگی اللہ میاں۔ میں نے کہا اچھا بارش کون برساتا ہے؟ کہنے لگی کہ اللہ میاں۔ میں نے کہا جب یہ سارے کام حق تعالیٰ کرتے ہیں اور یہ سب کام بدستور جاری ہیں تو اس سے تو خود معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ زندہ ہیں۔ زندہ نہ ہوتے تو یہ کام کیسے ہوتے کہنے لگیں کہ اب سمجھ میں آ گیا۔ تو اس بیچاری بڑھیا نے بھی حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کہ اتنے زمانہ طویل سے موجود ہیں، معاذ اللہ بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ نہ معلوم زندہ بھی ہیں یا نہیں؟

یہ حکایت تو محلہ محات کی ہے۔ ایک قصہ محلہ نوگانوے کا ہے کہ وہاں سے ایک بڑی بی آئیں اور مجھ سے کچھ اپنے فقر و فاقہ کی شکایت کی، پھر کہنے لگیں کہ مولوی جی میں زیادہ کہتی بھی نہیں کہیں اللہ میاں خفا ہوں کہ میرے عیب کھولتی پھرتی ہے۔

ایک قصہ بنت کا ہے کہ وہاں ایک بڑی بی کہنے لگیں کہ میں یوں کہوں(۵) جب قیامت میں سب مر جائیں گے تو اللہ میاں کا اکیلے جی(۶) نہ گھبرائیگا؟ اب اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے خدا کو بھی لوگ اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔

ایک قصہ کانپور میں پیش آیا۔ وہاں ایک صاحب پوچھنے آئے تھے کہ توبہ توبہ حق تعالیٰ کے والدین کس جزیرہ میں رہتے ہیں؟ میں نے اس سوال کو سن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ سائل طالب ہے مگر جاہل ہے، بے چارہ کو حق تعالیٰ کے والدین کی

(۱) کم عقلی (۲) شک (۳) اس کی عقل کے مطابق (۴) بات کی (۵) میں یہ کہتی ہوں (۶) دل نہیں گھبرائے گا۔

سکونت(۱) دریافت کرنے کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ اللہ میاں کے دربار میں مغفرت کیلئے ان کو وسیلہ(۲) پکڑے۔ جب کہ حق تعالیٰ نے بندوں کو والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے، تو خود بھی ضرور اس پر عمل کریں گے اور اپنے والدین کے حکم کے خلاف ہرگز نہ کریں گے۔ تو اس خیال کا منشاء(۳) تو محض محبت ہے۔ مگر بوجہ جہالت کے حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا اور یہ نہ سمجھا کہ حق تعالیٰ والدین سے پاک ہے۔

حافظ عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ نے اس سوال کے جواب میں سورۃ اخلاص کا ترجمہ سنا دیا۔ مگر یہ باتیں ان جاہلوں کی اس لئے بُری نہیں معلوم ہوتیں کہ محبت سے کہی گئی ہیں۔ محبت کے ساتھ سب باتیں پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ شبانِ موسیٰ علیہ السلام کی سب باتیں حق تعالیٰ کو پسند ہوئیں کیونکہ سب کا منشاء محبت تھی۔ اس نے بھی خدا کو اپنے اوپر قیاس کیا تھا۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان خدا کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے تو شاید آیات وعید(۴) کو دیکھ کر جہلاء حق تعالیٰ کے غصہ کو اپنے غصہ پر قیاس کرتے جس سے ضعفاء(۵) کے دل ٹوٹ جاتے۔

تفسیری نکات

اس لئے حق تعالیٰ نے یوم تقوم الساعة یبلس المجرمون فرما کر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا ویوم تقوم ساعة یومئذ یتفرقون (۶)۔ یعنی گو جس دن قیامت ہوگی اس دن مجرم ناامید ہو جائیں گے مگر سب کا یکساں حال نہ ہوگا۔ جس دن قیامت آئے گی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے جو لوگ ایمان والے ہیں اور

(۱) رہائش پوچھنے (۲) واسطہ پکڑے (۳) اس خیال کی وجہ صرف محبت ہے (۴) دھمکی آمیز آیات کو دیکھ کر (۵) کمزوروں (۶) سورۃ الروم آیت ۱۴۔

انہوں نے اچھے عمل کیے ہیں وہ ایک بڑے باغ میں خوش کیے جائیں گے۔

یوم تقوم الساعة کے بعد یومئذ پھر زیادت تہویل(۱) کیلئے مکرر لایا گیا۔ فی روضة(۲) میں تنوین تعظیم کیلئے ہے یعنی بڑے باغ میں خوش کیے جائیں گے یحبرون احبار سے ہے جو باب بافعال کا مصدر ہے بمعنی ''سر'' جس کے بے تکلف معنی اردو محاورہ کے موافق یہ ہوئے کہ وہ بڑے باغ میں مسرور ہوں گے کیونکہ 'سر' بھی لازمی نہیں، متعدی(۳) ہے۔ دیکھئے حق تعالی نے اس مقام پر یفرحون نہیں فرمایا کیونکہ فرح لازم ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایمان والے جنت میں خوش ہوں گے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر طبعی خوشی انسان کو ہوسکتی ہے اس قدر ان کو خوشی حاصل ہوگی سو یفرحون سے طبعی خوشی پر زیادتی سمجھ میں نہ آتی، یحبرون کی بات بتلادی گئی کہ انکو طبعی خوشی سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوگی۔ کیونکہ ان کو خوش کیا جائے گا یعنی ان کو خوش کرنے کا اہتمام ہوگا۔ کوئی خوش کرنے والا ان کو خوش کرے گا۔

جیسا کہ علماء نے یہی نکتہ مطہرة میں بیان فرمایا ہے کہ ازواج مطہرة کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو پاک کیا ہے صرف یہی نہیں کہ وہ خود بخود پاک ہیں۔ کیونکہ جو پاکی خود بخود حاصل ہوتی ہے وہ کم ہوتی ہے۔ دیکھئے اگر ایک کپڑے کو دن رات نہر میں ڈالے رکھیں تو وہ خود بخود پاک ہوجائے گا، مگر جو خوبی اس وقت حاصل ہوگی کہ اس

(۱) لفظ یومئذ یعنی ''اس دن'' کا اضافہ زیادہ شوق دلانے کیلئے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے (۲) 'روضہ' باغ کو کہتے ہیں اس پر تنوین یعنی دو زبر کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بڑا باغ۔ اس لئے کہ عربی میں تنوین عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے بھی استعمال ہوتی ہے (۳) عربی میں افعال کی دو قسمیں ہیں ایک فعل لازم کہلاتا ہے جس میں بات صرف فاعل پر مکمل ہوجائے ایک فعل متعدی کہلاتا ہے جو فاعل کے علاوہ مفعول کو بھی چاہے۔

کو کسی شخص کے سپرد کیا جاوے کہ وہ پانی میں ڈال کر تختہ پر اسے کوٹ پیٹ کر صاف کرے وہ صرف نہر میں ڈالے رکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہی نکتہ "یحبرون" میں ہو سکتا ہے یعنی یہی صرف نہیں کہ وہ خوش ہوں گے بلکہ خوش کیے جائیں گے اور ان کو حق تعالیٰ شانہ خوش کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کتنے بڑے ہیں ان کی عظمت کے موافق ان کی دی ہوئی خوشی بھی عظیم ہوگی۔ اتنا فرق ہوگا کہ حق تعالیٰ شانہ کی عظمت تو بالفعل بھی غیر متناہی(۱) ہے اور اہل جنت کی خوشی بالفعل اگرچہ متناہی ہوگی، مگر لا تقف عند حد(۲) کے اعتبار سے وہ بھی ایک طرح غیر متناہی ہوگی۔ اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عظمت الٰہی داخل مشیت(۳) نہیں اور عظمت و سرور(۴) اہل جنت داخل مشیت ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کے ارادہ و اختیار کو اس میں دخل ہے اور حادث کی لامتناہی بالفعل محال اور لا تقف عند حد جائز(۵) ہے غرض غیر متناہی دونوں ہیں ایک غیر متناہی بالفعل اور دوسرا غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے الا ماشاء ربك کی تفسیر بھی

---

(۱) اللہ کی بڑائی اور عظمت ایسی ہے کہ اس کو کوئی حد اور انتہا نہیں کہ وہاں ختم ہو جائے بلکہ وہ بڑائی اور عظمت نہ ختم ہونے والی ہے (۲) خوشی چونکہ ایک فعل ہے اس لئے اگرچہ اس کو ختم ہونے والا ہونا چاہئے لیکن چونکہ اس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہوگی اس لئے وہ بھی لامتناہی یعنی نہ ختم ہونے والی ہوگی (۳) اللہ کی بڑائی اور عظمت اس کے ارادہ پر موقوف نہیں بلکہ وہ اللہ کی صفت ذاتی ہے جو اس کی ذات کی طرح خود بخود ہے اور خدا کی ذات کی کوئی ابتداء اور انتہا نہیں اسی طرح اس کی عظمت کی بھی بالفعل کوئی انتہا نہیں (۴) اور جنت والوں کی خوشی اور بڑائی (۵) اور جو چیز حادث ہو یعنی پہلے نہیں تھی اور اب موجود ہوگئی تو اس کی بالفعل انتہاء ہوا کرتی ہے اور جنت چونکہ پہلے نہیں تھی اللہ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی اس لئے وہ بھی حادث ہوئی اور بالفعل ایسا ہونا کہ اس کی انتہاء نہ ہو، ناممکن ہے۔ البتہ اگر اللہ کا ارادہ یہ ہو کہ وہ کسی حد پر جا کر نہ رکے تو اس اعتبار سے لامتناہی ہوگی۔ جنت اور اہل جنت کی خوشی اسی اعتبار سے لامتناہی ہے۔

یہی لکھی ہے کہ خلود اہل جنت واہل نار داخل تحت القدرت(۱) ہے۔ اگر چہ منقطع کوئی بھی نہ ہوگا۔ ورنہ بدوں اس توجیہہ کے بظاہر اس استثناء پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت واہل جہنم کے خلود کیساتھ الا ماشاء ربك(۲) کیا معنی؟ کیونکہ بظاہر اس کا ترجمہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ جنت اور دوزخ میں رہیں گے۔ مگر جب کہ چاہیں حق تعالی تو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی نکالے بھی جائیں گے۔ سو مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب تفسیر فرمائی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے، مگر خدا جب چاہے تو ان کو نکالنے پر بھی قادر ہے مگر ایسا کیا کبھی نہ جائے گا۔ تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر خدا تعالی اس پر مجبور نہیں بلکہ یہ سب اسی کی مشیت(۳) سے ہوگا وعلی ہذا اہل نار(۴) بھی۔

پس جس طرح اہل جنت واہل نار کا خلود بوجہ داخل تحت القدرت ہونے کے غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد (۵) ہے اسی طرح اہل جنت کی خوشی بھی غیر متناہی اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس دقیق مضمون کو اپنی تفسیر میں نہایت ہی سلیس الفاظ میں بیان فرمایا ہے، جس سے ہر شخص کا ذہن اس معنی کی

(۱) جنتیوں اور دوزخیوں کا ہمیشہ جنت دوزخ میں رہنا اللہ کے اختیار میں ہے جب چاہے ختم کردے اگر چہ ختم کوئی بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ نے خود اس کو ہمیشہ باقی رکھنا بیان فرمایا ہے (۲) اس توجیہہ کے بغیر آیت کے معنی کہ جس میں دوزخیوں اور جنتیوں کا ہمیشہ ہمیشہ رہنا بیان فرما کر پھر یوں کہنا کہ مگر جب تک اللہ چاہے بظاہر اس اشکال کو پیدا کرتا ہے کہ کبھی نکالے بھی جائیں گے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ تعالی کا قادر ہونا اور چیز ہے اور اس کو کرنا اور چیز ہے۔ اس لئے اللہ نکالنے پر قادر ضرور ہے لیکن وہ نکالے نہیں جائیں گے۔ اس لئے کہ قادر ہونے سے وقوع پذیر ہونا لازم نہیں آتا (۳) اسی کے چاہنے سے (۴) اور اسی طرح دوزخ والے بھی (۵) جس طرح دوزخیوں اور جنتیوں کا ہمیشہ کا داخلہ جنت ودوزخ اللہ کی قدرت کے تحت ہونے کے باوجود کہ وہ نکال بھی سکتا ہے پھر بھی ہمیشہ رہیں گے اس معنی کے اعتبار سے لامتناہی ہے کہ اس رہنے کی کوئی حد نہیں بیان کی۔

طرف منتقل بھی نہیں ہوتا اور ظاہر میں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے اشکال کا جواب ہے۔ البتہ جو لوگ مدرس ہیں اور مواقع اشکالات سے واقف ہیں وہ اس کی قدر کر سکتے ہیں اور یہ شاہ صاحب کا اور بھی بڑا کمال ہے کہ ایسے دقیق(۱) مضمون کو معمولی لفظوں سے تعبیر فرما دیتے ہیں۔ اسکی قدر بھی پڑھانے والے ہی جانتے ہیں کہ کم فہم لوگوں کے لئے مضمون کے سہل(۲) کرنے میں کس قدر تعب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

حضور ﷺ کی بعثت اللہ کی رحمت ہے

غرض اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں ایمان و اعمال صالحہ کا ثمرہ مذکور ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ والے جنت میں خوش ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ بغیر انبیاء علیہم السلام کے نہیں معلوم ہو سکتے اسی لئے حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ لوگوں کو ایمان و اعمال صالحہ کا رستہ بتلا دیں۔ اور اس وقت اول تو کسی اور نبی کی شریعت موجود نہیں اور اگر پہلے انبیاءؑ میں سے کسی کی کوئی شریعت ہے بھی تو محرف(۳) ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر اگر غیر محرف بھی ہوتی تو منسوخ(۴) تھی۔ اس لئے اس وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت صرف ہمارے حضور ﷺ کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر حضور ﷺ تشریف نہ لاتے تو ہم اس دولت سے بالکل محروم رہتے۔ حق تعالیٰ شانہ کا بہت بڑا احسان ہمارے اوپر ہوا کہ آپ کی برکت سے ہم کو اس دولت سے سرفراز فرمایا۔ اسی کو حق تعالیٰ شانہ نے

---

(۱) ایسے مشکل مضمون کو (۲) مضمون کو آسان کرنے میں کتنی مشقت اٹھانی پڑی ہے (۳) اس میں تحریف و تبدیلی واقع ہو چکی ہے (۴) اگر اپنی اصلی حالت میں بھی ہوتی تو شریعت محمدی کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہوتی۔

بطریق امتنان، احسان جتلا کر جابجا قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے۔ کہیں فرماتے ہیں۔

ولو لا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لا تبعتم الشیطان الا قلیلا(۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ولو لا فضل اللہ علیکم ورحمة لکنتم من الخسرین(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان مواقع میں فضل اللہ و رحمة کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر محمد ﷺ کو مبعوث فرما کر خدا تعالیٰ تم پر اپنا فضل و رحمت نہ فرماتے تو تم ناکام اور محروم رہتے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعثت محمدیہ سے تم پر رحم و کرم نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے سوائے تھوڑے آدمیوں کے۔

شبہ اور اس کا جواب

اس جگہ ایک اشکال طالب علمی ہوسکتا ہے کہ الا قلیلا کے بڑھا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بدوں (۳) بعثت محمدیہ کے بھی راہ مستقیم (۴) پالیتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اتباع سے مراد اتباع مطلق ہے نہ کہ مطلق اتباع۔ پس معنی یہ ہوئے کہ تم شیطان کے پورے متبع ہوا کرتے۔ صرف بعضے لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے

---

(۱) اگر اللہ تعالیٰ (حضور ﷺ کی بعثت سے) اپنا فضل و رحمت نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے سوائے تھوڑے لوگوں کے۔ سورۃ النساء آیت ۸۳ (۲) سو اگر تم پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو ضرور تم تباہ ہو جاتے۔ سورۃ البقرہ آیت ۶۴ (۳) بغیر (۴) سیدھا راستہ۔

عقل کامل وسلیم عطا فرمائی ہے وہ البتہ کامل اتباع شیطان کا نہ کرتے۔ یعنی ایسے امور میں جن میں عقل کام دے سکتی ہے، صرف ان میں اتباع شیطان کا خاص ایسے لوگ نہ کرتے۔ گو مطلق اتباع شیطان سے یہ بھی نہ بچتے کیونکہ جن میں عقل کام نہیں دیتی ان میں کوئی مانع اتباع شیطان سے نہ تھی۔

تفصیل امور مذکورہ(۱) کی یہ ہے کہ بعض احکام شریعت کے بدیہی(۲) اور ظاہر ہیں جن کا حسن وقبح(۳) عقل سے بھی معلوم ہوسکتا ہے تو ایسی باتوں میں عقل سلیم سے راہ راست معلوم ہوسکتی ہے۔ مثلاً ظلم کا قبیح(۴) ہونا، انصاف کا پسندیدہ ہونا، زنا کی برائی، عفت و پارسائی کی خوبی، ان باتوں میں بعض لوگ راہ مستقیم پر چل سکتے اور شیطان کے اتباع سے بچ سکتے تھے۔ گو تفصیلی احکام بدوں(۵) نبوت کے ان میں بھی نصیب نہ ہوتے مگر خیر کسی قدر اتباع شیطان سے ان باتوں میں محفوظ رہ سکتے تھے۔ مگر چونکہ ایسی باتیں تھوڑی ہیں ان کے معلوم کر لینے ہی سے کیا کام چلتا؟ بہت سی باتیں عبادت الٰہی کے متعلق ایسی ہیں جن کو عقل کبھی دریافت نہیں کرسکتی تھی، بالخصوص صفات وذات باری تعالیٰ وامور معاد کا تو بدوں(۶) بعثت محمدیہ کے کچھ بھی نہ پتا چلتا، اور نہ معلوم خدا تعالیٰ کے متعلق ہم کیا اعتقاد قائم کر لیتے جیسا کہ کفار نے کر لیے ہیں پھر خود وہ عقل بھی بدولت رسول ﷺ ہی کے عطا ہوئی کیونکہ حضور ﷺ واسطہ ہیں تمام کائنات کے۔ پس آپؐ کے وجود کو اس وقت بھی سلوک صراط عقل(۷) میں دخل رہتا۔

بہر حال اصل فضل ورحمت جو قابل مسرت وخوشی ہے وہ یہ امر ہے کہ ہم کو

---

(۱) اوپر جو باتیں ذکر کی ہیں انکی تفصیل یہ ہے (۲) واضح (۳) اچھا برا ہونا (۴) برا ہونا (۵) بغیر (۶) اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات نیز آخرت کے معاملات تو اگر حضور ﷺ نہ بھیجے جاتے اور آپ نہ بتاتے تو پتہ ہی نہ چلتا (۷) عقل کے راستہ پر چلتے ہیں۔

حضور ﷺ کے وجود باوجود کی برکت سے ایمان واعمال صالحہ کی توفیق ہوئی اور یہ عظیم نعمت حاصل ہوئی جس سے ہماری دنیا وآخرت سنور گئی، اور انشاء اللہ اس کی برکت سے ہم جنت میں خوشیاں منائیں گے۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس آیت کے مضمون کو مقصود کے ساتھ پورا تعلق ہے۔

برکات نور حضورؐ

اس آیت میں ایمان اور اعمال کا ثمرہ مذکور ہے اور ایمان واعمال صالحہ وجود باجود محمدیؐ کے ثمرات ہیں۔ تو یہ ثمرات بھی جو اس آیت میں مذکور ہیں حقیقت میں حضورؐ ہی کے وجود باجود (۱) ونور مزبور السرور (۲) کے ثمرات ہیں۔ تو یہ ثمرات تو ان کو دوسرے دلائل کے ساتھ منضم (۳) کرنے سے حضورؐ کے نور مبارک کی برکات دو قسم پر معلوم ہوئیں ایک صوری جو کہ اشیاء کے وجود وظہور کے متعلق ہیں۔ دوسرے معنوی جو ان اشیاء میں سے خاص اہل ایمان کے صدور (۴) کے متعلق ہیں۔

ظہور کے متعلق تو آپؐ کے نور مبارک کی برکت یہ ہے کہ تمام عالم کا وجود آپؐ کے نور سے ہوا اور لوگ اسی کو آجکل زیادہ بیان کرتے ہیں۔ صدور (۵) کے متعلق آپؐ کی برکات یہ ہیں کہ ایمان ومعرفت الٰہی سب حضورؐ ہی کے واسطے سے حاصل ہوئیں۔ ان برکات کو لوگ آجکل بیان ہی نہیں کرتے، بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ زیادہ ضرورت اسی کے بیان کرنے کی ہے۔ کیونکہ جو اثر آپؐ کے نور کا ظہور (۱) کے متعلق ہے، اس کے آثار تو محسوس ہیں۔ اور جو اثر صدور (۲) کے متعلق ہے

---

(۱) حضور ﷺ کا وجود جو سراپا سخاوت ہے (۲) اور آپ کا نور جو خوشی کی زیادتی کا باعث ہے (۳) ملانے سے (۴) سینوں (۵) سینے یعنی دل کے متعلق۔

اس کے آثار یعنی خاص ثمرات مقصودہ وہ قیامت و جنت میں معلوم ہوں گے اور یہاں ان سے ذہول (۳) ہے۔ نیز وہ رتبہ میں بھی اعظم (۴) ہیں اسی لئے زیادہ ضرورت اسی کے بیان کرنے کی ہے۔ اور اعظم ہونیکی وجہ ظاہر ہے کیونکہ ظہور پر تو صرف اسی قدر اثر ہوا کہ ہم موجود ہو گئے، مگر صرف موجود ہو جانے سے کچھ زیادہ فضیلت نہیں حاصل ہو سکتی۔ پوری فضیلت ایمان و معرفت الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جس کیوجہ سے انسان کو حیوانات پر شرف (۵) ہے۔

تیسرے یہ جو اثرات نور مبارک کے ظہور پر ہوئے وہ متناہی اور محدود (۶) ہیں، کیونکہ موجودات اپنی ذات کے اعتبار سے متناہی (۷) ہیں۔ اور صدور پر جو اثر ہوا وہ غیر متناہی (۸) ہے۔ کیونکہ معرفت الٰہی کے مراتب اور ان کے ثمرات غیر متناہی (۹) ہیں جو ہم کو جنت میں نصیب ہوں گے۔ بس آپؐ کے نور مبارک کے وہ برکات زیادہ بیان کرنے کے قابل ہیں جو صدور پر متجلی (۱۰) ہیں۔ اس آیت شریفہ میں انہی ثمرات کا ذکر ہے مگر یہ ثمرات اس آیت کے آخر میں مذکور ہیں۔ اور ایک ثمرہ آپؐ کے تبرکات متعلقہ صدور کا اس آیت کے شروع ہی میں مذکور ہے جو عجیب ثمرہ ہے۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

ویوم تقوم الساعة یومئذ یتفرقون

---

(۱) آپؐ کے نور ہی کی برکت سے سب چیزیں ظاہر ہوئی ہیں (۲) آپؐ کے نور کا جو اثر دلوں پر پڑ رہا ہے اس کا اثر قیامت میں معلوم ہوگا (۳) غفلت ہے (۴) بڑے ہیں (۵) اس لئے کہ ظہوریت میں تو حیوان و انسان برابر ہیں لیکن ایمان کی فضیلت جیسی انسان کو حاصل ہے کسی حیوان کو نہیں (۶) وہ ختم ہونیوالے اور ایک حد تک ہیں (۷) ہر موجود اپنی ذات کے اعتبار سے ختم ہونے والا ہے (۸) دل پر اثر نہ ختم ہونے والا ہے (۹) اللہ کی معرفت کے مراتب کی کوئی انتہا نہیں (۱۰) جن سے انسان کا دل منور ہے۔

قیامت جب قائم ہوگی تو لوگ جدا جدا ہو جائیں گے یہ جدا جدا ہونا بھی حضورؐ ہی کے نور مبارک کا ایک ثمرہ ہے کیونکہ ایمان ومعرفت واعمال صالحہ کا حصول آپ کی برکت سے ہوااور ایمان واعمال صالحہ کی کیوجہ سے مخلوق کے دو فرقے ہو گئے بعض مومن بعض کافر۔تو اس تفریق کا اصل منشاء(۱) بھی نور محمدی ﷺ ہے اسی تفریق کے ظاہر کرنے کیلئے قیامت قائم ہوگی(۲) تو دراصل حقیقی قیامت آپؐ ہی ذات(۳) ہےاور عرفی قیامت اس کا ایک اثر اور ثمرہ(۴) اسی کو مولانا نے مثنوی میں ایک جگہ بیان فرمایا ہے۔

صد قیامت بود احمد در جہاں(۵)

حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ ''محمد فرق بین الناس''(۶) قرآن شریف کا لقب بھی فرقان(۷) اسی وجہ سے ہے کہ وہ فارق ہے۔ غرض قیامت قائم ہونے کا سبب یہی تفریق ہے اور یہ تفریق قیامت تابع ہے تفریق محمدی کے۔اسی کے اظہار کیلئے قیامت قائم کی جائے گی۔غرض اصل سروران برکات محمدیہ سے ہے کہ ہم اطاعت ومعرفت الٰہی کی دولت حاصل کریں جس کے ثمرات قیامت و جنت میں حاصل ہوں گے نہ وہ باتیں جو آج کل ہم لوگ خود بخود گھڑتے ہیں۔

---

(۱) دو فرقے کافر اور مومن ہونے کا اصل سبب بھی حضور ﷺ کا نور ہے کہ جس نے آپ کا اتباع کیا مسلمان کہلایا جس نے انکار کیا کافر بنا(۲) اس فرق کو ظاہر کرنے کیلئے قیامت قائم ہوگی کہ پتہ لگ جائے کہ کس نے مانا کس نے نہیں(۳) کہ آپؐ کے ظہور ہی سے پتہ لگ گیا کہ کونسا فرقہ جنتی ہے کونسا دوزخی جس نے مانا جنتی جس نے انکار کیا دوزخی(۴) اس ماننے نہ ماننے کا اثر اور پھل یہ ہے کہ ماننے والے جنت میں اور نہ ماننے والے دوزخ میں(۵) احمد کا وجود دنیا میں سو قیامت کا باعث ہے(۶) حضور نے لوگوں کے فرق کو واضح کیا یعنی حق و باطل میں فرق واضح ہوا(۷) حق و باطل میں فرق کرنے والا۔

بدعت وضلالت

یعنی عید میلاد وغیرہ کیونکہ حضورؐ نے ہم کو ان باتوں کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ صراحۃً(۱) منع فرمایا ہے اور عید میلاد کے متعلق گو بہت دفعہ بیان ہو چکا ہے اور اصول شریعت بتلا دیا گیا ہے کہ یہ فعل بالکل ناجائز اور بدعت وضلالت ہے، مگر اس دفعہ مجھے ایک حدیث اس کے متعلق بہت صریح ملی ہے جس سے صاف صاف اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ حدیث ہے کہ "لا تتخذوا قبری عیداً" اس حدیث سے عید میلاد کی نفی نہایت واضح ہے اور میرے لئے یہ حدیث بالکل تسلی بخش ہوگئی۔ میں دوسروں کیلئے بھی تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کرتا ہوں کہ اس حدیث سے عید میلاد کی نفی کیونکر ہوگئی۔

حیات النبیؐ

حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میری قبر کو عید نہ بناؤ۔ اول بطور مقدمہ کے جاننے کہ حضورؐ کی قبر مبارک کیلئے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضورؐ خود یعنی جسد مع تلبس الروح(۲) کے اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں۔ صحابہؓ کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث میں بھی نص ہے۔ ان نبی اللہ حی فی قبرہ یرزق۔ کہ آپؐ اپنی اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ اور آپؐ کو رزق بھی پہنچتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے۔ وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیات برزخیہ

---

(۱) واضح طور پر (۲) جسم روح سمیت۔

کہتے ہیں۔

قبر کی زندگی کے مختلف درجات

باقی یہ کہ حیات برزخیہ تو سب کو حاصل ہے پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص(۱) ہے؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اسکے مختلف مراتب ہیں۔ ایک مرتبہ تو تمام جماعت مومنین کو حاصل ہے جس کے ذریعہ سے نعیم قبر کی ہر مسلمان کو حس(۲) ہوگی۔

دوسری حیات شہداء کی ہے۔ یہ عام مومنین کی حیات برزخیہ(۳) سے اقوی(۴) ہوگی۔ عام مومنین کی حیات برزخیہ بہ نسبت شہید کے کمزور ہوتی ہے اگر چہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلی(۵) ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عام مومنین کی حیات برزخہ اس حیات دنیوی سے بھی کمزور ہوگی۔ اور حیات شہید کے اقوی ہونے کا ثمرہ(۶) یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھاتی۔ اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات کا۔ پس شہید میں اس اثر کا ظاہر ہونا اور عام مومنین میں اس کا نہ ہونا یہ دلیل ہے شہید کی حیات کے اقوی ہونے کی بہ نسبت عام کی حیات کے۔

منکرین حیات برزخیہ کا رد

بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی کیونکہ جس طرح اس کے خلاف(۷) مشاہدہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے۔ جب دونوں طرح مشاہدہ موجود ہے تو سرے

---

(۱) خصوصیت (۲) قبر کی نعمتوں کا ہر مسلمان کو احساس ہوگا (۳) انکی قبر کی زندگی (۴) زیادہ قوی (۵) اس دنیوی زندگی سے دو کئی درجہ بڑھی ہوئی ہوگی (۶) شہید کی حیات قوی ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر اس کی لاش کو زمین نہیں کھاتی (۷) اس کے خلاف دیکھنے میں آیات ہے کہ لاش کو زمین کھا گئی موافق بھی دیکھنے میں آیا کہ لاش اپنی اصلی حالت میں رہی ہے۔

سے اس کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلی نہیں اکثری(۱) ہے اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا(۲) جاوے گا۔ باقی مطلق انکار تو صحیح نہیں ہو سکتا۔

یہ تو جواب تسلیمی(۳) ہے اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید ہی تھا مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو، کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں کہ معرکہ میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کیلئے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں۔ مثلاً نیت کا خالص ہونا بوجہ اللہ(۴) جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اسکے خلاف مشاہدہ کیا وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا۔ اور یہ حیات کا قوی درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہو کہ اس کی لاش گل گئی۔ مثلاً اس جگہ کی مٹی تیز ہو۔ ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی تو اس کی لاش نہ جلے۔ بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کر دیا جائے جیسا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریت زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی۔ بعینہٖ محفوظ رہے گی۔

انبیاءؑ کی حیات برزخی کے دلائل

---

(۱) یہ ایسا قاعدہ نہیں ہے کہ ہر شہید کے ساتھ ہو بلکہ اکثر ہے یعنی اکثر ایسا ہوتا ہے (۲) اور حدیث میں جہاں اس حیات کا ذکر ہے اسکو اسی اکثر پر منطبق کریں گے (۳) یہ جواب تو جب ہے کہ ہم مان لیں کہ کوئی شہید تھا پھر اس کو لاش کو زمین نے کھالیا (۴) اللہ کیلئے۔

تیسرا درجہ جو سب سے زیادہ قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کیلئے ہے، کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی۔ حدیث میں ہے۔

حرم اللہ اجساد الانبیاء علی الارض(۱)

اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور وہ حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہرات سے بعد انکے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں۔ نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ میں تقسیم نہیں ہوتی۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ماترکنا صدقة

انبیاء علیہم السلام کا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔ یہ باتیں شہید کیلئے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت نے اس کا خاص کوئی راز نہیں بیان کیا۔ مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں۔ اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے۔ ان دونوں امروں(۳) سے گو ازواجِ نبی سے بعد وفات نبی کے نکاح حرام ہونا تمام انبیاء کے بارہ میں منقول نہیں ہوا، صرف حضور ﷺ کیلئے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے۔ مگر علماء حکم میراث پر قیاس کر کے اس حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کیلئے سمجھتے ہیں(۱)۔ اور میراث کا تقسیم نہ ہونا حدیث سے جملہ(۲) انبیاء علیہم

---

(۱) اللہ نے زمین کے لئے انبیاء کے اجسام کو کھانا حرام کر دیا ہے (۲) قرآن وسنت سے ثابت ہے (۳) نبی کی حیات ہی ان دونوں کاموں سے رکاوٹ کا باعث ہے اس لئے کہ میراث مردہ کی ہوتی ہے زندہ کی نہیں اور بیوی نکاح ثانی شوہر کے مرنے پر کر سکتی اس کی زندگی میں نہیں۔

السلام کیلئے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء، شہداء اور عام مومنین سے قوی ہونا (۳) ثابت ہوا۔

حیات برزخی پر غیر مسلموں کا یقین

بہر حال خاص بات باتفاق امت (۴) ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں اور خاص ہمارے حضور ﷺ کے بارہ میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں۔ ان کو بھی حضور کی حیات کا اقرار ہے۔

چنانچہ اس واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہو جائے گا۔ تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا جاتا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے چند صدی بعد (یاد نہیں رہا کس بادشاہ کے وقت میں) دو شخص مدینہ میں حضورؐ کے جسد اطہر کو نکالنے کیلئے آئے تھے، مسجد نبوی کے پاس ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور دن میں نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے۔ لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے۔ زاہد مشہور ہو گئے تھے۔ وہ کم بخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے، اور جس قدر سرنگ کھود لیتے تو رات و رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے۔ اور جگہ برابر کر دیتے تھے تا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے۔

جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان

---

(۱) میراث تقسیم نہ ہونے کا حکم سب نبیوں کیلئے ہے اس لئے انبیاء کی بیبیوں کو بغیر وفات نبی دوسرے نکاح کی اجازت بھی نہیں ہوگی اور اسی طرح یہ حکم بھی عام ہوتا ہے (۲) سب انبیاء (۳) ان خصوصیات کی وجہ سے نبی کی قبر کی زندگی شہید اور عام مسلمان سے زیادہ قوی ہے (۴) پوری امت اس بات پر متفق ہے۔

کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا۔ خواب میں حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ کا چہر مبارک پر حزن وغم کے آثار(۱) ہیں۔ اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرمارہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذاء(۲) دے رکھی ہے جلد مجھے ان سے نجات دو۔ خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلائی گئی۔ خواب سے بیدا ہوکر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا۔ وزیر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے، آپ جلد مدینہ تشریف لے جاویں۔ بادشاہ نے فورا فوج لے کر بہت تیزی سے مدینہ کی طرف سفر شروع کیا اور بہت جلد مدینہ پہنچ گیا۔

اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک دن بادشاہ کو اور تاخیر ہو جاتی تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے۔ بادشاہ نے مدینہ پہنچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکلنے کا حکم دیا، اور خود دروازہ پر کھڑے ہوکر ہر شخص کو خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے سب مرد شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو سخت حیرانی ہوئی اور لوگوں سے کہا کہ کیا سب لوگ باہر آ گئے؟ لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا۔ بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ضرور کوئی اندر ہے۔ لوگوں نے کہا کہ دو زاہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی دعوت میں نہیں جاتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا مجھے ان ہی سے کام ہے۔

چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو بعینہ (۱) وہ دو صورتیں نظر پڑیں۔ جو خواب

(۱) پریشانی اور غم کی علامات چہرہ انور پر پائی جاتی ہیں (۲) تکلیف۔

میں دکھلائی گئی تھیں۔ان کو فوراً قید کرلیا گیااور پوچھا گیا کہ تم نے حضور ﷺ کو کیا ایذا(۲) دی ہے؟ چنانچہ بڑی دیر بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر کو نکالنے کیلئے سرنگ کھودی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہنچ چکی ہے۔ بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسے دے کر سرنگ بند کرادی اور زمین کو پانی کی تہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا تا کہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح وسالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کئی سو برس کے بعد بھی اس کے نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ نہ ہونے کا یقین ہوتا تو وہ سرنگ کیوں لگاتے۔ محض وہم وشبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا۔ وہ لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی۔

قبر شریف کا آپؐ کے جسم سے متصل حصہ عرش سے افضل ہے

وہ خوب جانتے ہیں کہ حضورؐ نبی برحق تھے مگر بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ جب حضور کا جسد اطہر موافقین ومخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے اور مع روح(۳) ہے جیسا کہ بیان کیا گیا، تو ظاہر ہے اور علماء نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ بقعہ جس سے جسم مبارک خصوص مع الروح مس کیے ہوئے(۴) ہے۔ عرش سے بھی افضل ہے۔ کیونکہ عرش پر معاذ اللہ(۱) حق تعالیٰ شانہ بیٹھے ہوئے ہوتے تو بے شک وہ

(۱) وہ وہی دو شکلیں تھیں جو خواب میں دیکھی تھیں (۲) تکلیف دی (۳) روح سمیت ہے (۴) جسم مبارک مع الروح زمین کے جس حصے سے ملا ہوا ہے۔

جگہ سب سے افضل ہوتی۔ مگر خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہیں اس لئے عرش کو مستقر (۲) خداوندی نہیں کہا جا سکتا۔

استویٰ علی العرش کے معنی

اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ استوی علی العرش کے معنی استقرار کے نہیں ہو سکتے کیونکہ بیٹھنے کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو بیٹھنے والے سے زیادہ یا کم سے کم اس کے برابر تو ہو۔ مثلاً اگر ہم تخت یا کرسی پر بیٹھیں اور اس کے اوپر ایک تنکا پڑا ہوا ہو تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم تنکے پر مستقر (۳) ہوئے کیونکہ اسکو ہم سے کچھ نسبت نہیں اس لئے وہ ہمارا مکان نہیں بن سکتا۔ پس اسی طرح عرش خدا تعالیٰ اک مکان نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے وہ نسبت بھی نہیں جو رائی کے دانہ کو ہم سے ہے۔ اس دلیل سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ استوی علی العرش کے معنی بیٹھنے کے ہرگز نہیں ہیں۔

اب سوال ہوگا کہ پھر کیا معنی مراد ہیں۔ اس میں سلف کا مسلک تو یہ ہے کہ سکوت (۴) کرو، اور واقعی سلامتی اسی میں ہے مگر متاخرین نے بمصلحت وقت کسی مناسب تاویل کر دینے کی اجازت دی ہے۔ جب مصلحت کی بناء پر باب تاویل مفتوح (۵) ہو گیا تو ہر شخص کو مناسب تاویل کر دینے کا حق ہے۔

ایک تاویل میرے ذہن میں اس آیت کی آئی ہے جو دوسری تاویلوں کی بہ نسبت اقرب (۱) اور بہت صاف ہے اگرچہ میرا مذاق طبعی اس بارہ میں سلف کے

---

(۱) اللہ کی پناہ (۲) خدا کی جائے قرار (۳) تنکے پر بیٹھنے (۴) متقدمین علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کے معنی بیان نہ کریں خاموشی اختیار کریں (۵) تاویل کا دروازہ کھل گیا۔

موافق ہے لیکن جو لوگ بضرورت تاویل کرنا ہی پسند کرتے ہیں وہ میری اس تاویل کو بھی ان ہی تاویلوں میں جگہ دے دیں۔

میرے ذہن میں اس استوی علی العرش کے متعلق یہ بات آئی ہے کہ بعض آیات میں استوی علی العرش کے بعد یدبر الامر بھی آیا ہے جس کو استوی علی العرش کا بیان قرار دیا جائے تو یہ محاورہ ایسا ہو جائے گا کہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے کہ ولی عہد تخت نشین ہو گیا۔ عرف میں تخت نشین ہونے کے معنی حکمران ہونے کے ہیں۔ خاص تخت پر بیٹھنا ضروری نہیں۔ اسی طرح استوی علی العرش کے معنی تدبیر حکمرانی فرمانے کے ہیں یعنی زمین و آسمان کو پیدا فرما کر حق تعالیٰ شانہ ان آسمان و زمین میں حکمرانی و تدبر و تصرف کرنے لگے۔ پس اگر تاویل کی جاوے تو یہ تاویل بھی عمدہ اور لطیف تاویل ہے پس یہ کنایہ ہوگا۔

قبر شریف کی عرش سے افضلیت کی وجہ

غرض حق تعالیٰ شانہ بوجہ مانعات عقلیہ (۲) کے استوی متعارف (۳) کا حکم نہیں کیا جا سکتا۔ تو عرش کو محل استقرار حق تعالیٰ کی وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ بقعہ شریفہ سے وہ افضل ہوتا (۴) بلکہ اس کو صرف اس وجہ سے اور اماکن پر فضیلت ہے کہ وہ ایک تجلی گاہ ہے اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ کون تجلی گاہ الٰہی ہوگا۔ پس اس

---

(۱) معنی کے زیادہ قریب (۲) عقلی رکاوٹوں کی وجہ سے (۳) استوی کے عرفی معنی مراد نہیں ہو سکتے (۴) عرش کو باقی تمام جگہوں پر فضیلت اس کے اللہ کے تجلی گاہ ہونے کی وجہ سے ہے اس وجہ سے نہیں کہ اللہ اس پر بیٹھا ہے اور اللہ کی تجلی کا سب سے بڑا مرکز حضور ﷺ کی ذات ہے اس لئے آپ ﷺ کے جسم سے جو جگہ متصل ہوگی وہ سب سے افضل ہوگی اس لئے کہ حضور ﷺ کے واسطے سے سب سے زیادہ تجلی الٰہی اسی جگہ پڑ رہی ہیں۔

نسبت کے اثر سے بھی بقعہ شریفہ خالی نہ رہا۔ اسلئے ہر طرح وہ جگہ جہاں حضور ﷺ تشریف فرما ہیں سب سے زیادہ اشرف ہوئی، کیونکہ تجلیات حق بواسطہ رسول اللہ ﷺ اس جگہ تمام اماکن سے زیادہ فائض ہوتے ہیں۔ بہر حال اس مسئلہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے۔ یہ تو ایک مقدمہ تھا کہ بقعہ شریفہ وقبر شریف تمام اماکن سے افضل ہے۔

عید میلاد النبیؐ منانے کی ممانعت

اب اس مقدمہ کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ قبر شریف تو بلا اختلاف بعینہ (۱) باقی ہے اس میں کبھی کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا اور یوم الولادت و یوم المعراج و یوم البعثت وغیرہ (۲) یقیناً باقی نہیں کیونکہ زمانہ غیر قار (۳) ہے۔ اور وہ دن جس میں حضور ﷺ کی ولادت ہوئی تھی اب یقیناً نہیں لوٹتا بلکہ اسکا مثل عود (۴) کرتا ہے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا۔

اس کے بعد یہ سمجھو کہ جب حضور ﷺ نے قبر کو عید بنانے سے منع فرمادیا اور اس کا عید بنانا حرام ہوگیا جو کہ یقیناً باقی (۵) ہے تو اب پیروں (۶) کو عید بنانا جو کہ بعینہ باقی نہیں ہے کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔ میرے نزدیک تو اس حدیث سے عید میلاد کی صراحۃً نفی ہوتی ہے۔ اب بھی کسی کو اس کی حرمت میں شک ہو تو وہ جانے اور اس کا کام جانے۔

---

(۱) اپنی اصلی شکل میں آج بھی باقی ہے (۲) پیدائش، معراج اور بعثت کے دن وغیرہ باقی نہیں (۳) زمانہ چل رہا ہے (۴) اس جیسا دوسرا دن ہوتا ہے وہی دن نہیں ہوتا اس لئے کہ جو وقت گذر جائے پھر نہیں آتا۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں (۵) یعنی قبر مبارک اسی حالت میں باقی ہے۔ پھر بھی اس پر عید بنانے کی ممانعت ہے (۶) تو اب پیر کے دن خوشی اور عید بنانا کہ اس روز آپؐ پیدا ہوئے تھے کب درست ہے؟ جبکہ وہی پیر کا دن اب نہیں ہے اور وہی تاریخ نہیں ہے۔ یہ اس کی مثل دوسرا دن اور تاریخ ہے۔

اس تقریر سے حضور ﷺ کی بلاغت اور کلام کی جامعیت بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ حضور ﷺ نے خاص طور پر قبر ہی کو عید بنانے سے کیوں منع فرمایا؟ سو اس لئے منع فرمایا کہ اس کی فضیلت وشرافت تو بوجہ معین اور یقینی ہونے کے سب کو مسلم ہوگی، جب ایسی چیز کی بابت کوئی حکم بیان کر دیا جائے گا اس پر ادنی کو قیاس کر کے بقیہ سب باتوں کا حکم معلوم ہو جائیگا۔ جب ان چیزوں کا عید بنانا معلوم ہو گیا کہ حرام ہے، اور قرآن میں نعیم جنت کا ایمان وعمل صالح پر ترتب صاف صاف مذکور ہے، اور عمل صالح میں حرام امور کے ترک پر موقوف ہے، تو اگر نعیم جنت حاصل کرنے کا اشتیاق ہے اور یقیناً ہر مسلمان کو ہے تو ان غیر مشروع کاموں کو چھوڑنا چاہئے کیونکہ نجات کلی بغیر اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ قرآن میں جا بجا آمنوا کے بعد عملوا الصلحت ضرور مذکور ہے(۱) اگر بدرجہ اتم واکمل نجات چاہیں تو ان چیزوں کو ترک کریں۔ بدرجہ اتم واکمل اس لئے کہا گیا کہ کسی نہ کسی وقت تو اہل بدعت بھی نجات پا ہی لیں گے۔ اگر چہ وہ ہمیں کافر کہیں مگر ہم ان کو کافر نہیں کہتے کہ محروم عن النجاۃ سمجھیں۔

(۱) قرآن میں صاف طور پر یہ حکم موجود ہے کہ جنت جب ملے گی کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو اور عمل صالح جب ہوگا کہ حرام باتوں سے بچا جائے اور جنت کو ہر شخص حاصل کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ سب کام کرے جن کا شریعت نے حکم دیا اور ان سب کاموں سے رکے جن سے روکا ہے۔ اور دلائل سے معلوم ہو گیا کہ آپ کی قبر کو عید بنانا اور ولادت کے دن یا تاریخ پر خوشی اور عید بنانا منع ہے اس سے رکنا چاہئے۔

اشکال

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ ہے جس کو میں دفع کر دینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں بجز ایک فرقہ کے سب ناری(۱) ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ ناجیہ(۲) صرف ایک ہی ہے۔ باقی ناجی نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر باقی فرقے بھی کچھ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں تو ان فرقوں میں اور فرقہ ناجیہ میں کیا فرق ہوگا؟ کیونکہ فرقہ ناجیہ جو کہ اہل حق ہیں ان کیلئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب کے سب بدوں(۳) حساب کتاب اور بدوں کسی قدر مواخذہ(۴) کے جنت میں جائیں گے۔ جیسا اہل حق میں بھی عصاۃ کو بھی نجات اولی حاصل نہیں(۵) تو دونوں میں فرق کیا ہوا؟ پھر حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہوگا کہ ان میں ناجی صرف ایک فرقہ ہے۔ معلوم ہوا کہ فرقہ ناجیہ کو تو کبھی نہ کبھی نجات حاصل ہو جائیگی اور باقی بہتر فرقوں کو کبھی نجات حاصل نہ ہوگی۔ تو یہ اہل بدعت کیونکر نجات پا سکتے ہیں۔ اگر اس کا التزام کیا جاوے تو اہل بدعت کی عدم تکفیر(۶) کے کیا معنی؟

جواب

جواب یہ ہے کہ مراد حدیث میں یہ ہے کہ وہ بہتر بوجہ فساد(۷) عقیدہ کے جہنم میں جائیں گے اور اہل حق جو کہ فرقہ ناجیہ ہے کہ فساد عقیدہ کی وجہ سے جہنم میں نہ

---

(۱) سوائے ایک فرقہ کے سب دوزخ میں جائیں گے (۲) نجات پانے والا فرقہ (۳) بغیر حساب کتاب (۴) بغیر کسی گرفت (۵) گناہگاروں کو بھی ابتداءً نجاۃ نہیں ہاں گناہوں کی سزا بھگت کر نجات ہوگی (۶) اگر یہ بات مان لی جائے تو جو لوگ بدعت میں مبتلا ہیں ان کو کافر نہ کہنے کا کیا مطلب (۷) عقیدہ کی خرابی کی وجہ سے۔

جائیں گے۔ دونوں میں مابہ الفرق دخول الفساد والعقائد(۱) ہے۔ باقی دخول للعمل یہ دونوں میں مشترک(۲) ہے۔ پس اس تقریر کے بعد اہل بدعت کا خلود(۳) ثابت نہ ہوا۔ اور اس تقریر کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ نص قطعی فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ☆ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ☆ (۴) سے معلوم ہے کہ اور جو کوئی ذرہ برابر بھی برائی کرے گا اس کو بھی دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ برابر برائی کرے گا اور اس کو بھی دیکھ لے گا۔ تو جس شخص میں کچھ ایمان ہے اگر چہ فساد عقیدہ ہی کے ساتھ ہے تو اگر وہ بھی ناجی(۵) نہ ہو تو وہ اس کی جزا(۶) کب پائے گا۔ آیا قبل دخول نار(۷) یا بعد دخول نار۔ قبل دخول نار تو محال(۸) ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ وہ اول جنت میں جاوے اور پھر وہاں سے خارج کر کے جہنم میں داخل ہو جاوے۔ اور نصوص(۹) سے معلوم ہے کہ بعد دخول جنت کسی کو عذاب نہ ہوگا۔ اور اگر جنت کے سوا اور کہیں ثواب پاوے تو جنت سے پہلے کوئی اور موقع ثواب کا نہیں۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے ایمان قلیل کی جزا(۱۰) بعد دخول نار پائے کہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو ورنہ اگر کہیں جزا نہ ملے تو لازم آئے گا کہ کوئی عمل صالح ایسا بھی ہوا جس کا کوئی صلہ کرنے والے کو نہ ملے۔ اور یہ اس آیت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اہل بدعت کو خلود(۱۱) ہوگا کبھی نجات نہ ہوگی بلکہ کبھی نہ کبھی تو نجات ضروری ہو جائیگی۔ گو اس سے پہلے عذاب بھی بھگتنا پڑے گا۔

---

(۱) اہل حق اور اہل باطل میں جہنم میں داخلہ کا فرق عقیدہ کی خرابی وعدم خرابی ہے (۲) اہل حق کا جہنم میں دخول عمل کی خرابی کی وجہ سے ہوگا عقیدہ کی وجہ سے نہیں (۳) ہمیشہ جہنم میں رہنا (۴) سورۃ الزلزال آیت ۷، ۸ (۵) نجات پانے والا (۶) اس عمل کا بدلہ (۷) آگ میں داخل ہونے سے پہلے یا بعد (۸) آگ میں داخلہ سے پہلے تو ناممکن ہے (۹) قرآن وحدیث سے (۱۰) بدلہ (۱۱) ہمیشہ

اہل بدعت کو سخت عذاب

البتہ یہ ضروری ہے کہ جو عذاب فساد عقائد سے ہو وہ اشد ہے اس عذاب سے جو فساد عمل سے ہو۔ چنانچہ احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بدعت کو دوسرے فساق سے زیادہ عذاب ہوگا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک جگہ میرا گزر ہوا تو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ اہل قبور کو عذاب ہو رہا ہے ہم نے ان کے لئے دعا کی تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت کے سوا سب کی اسی وقت مغفرت ہوگئی۔

اس لئے یوں تو سب گناہوں سے مسلمانوں کو بچنا چاہئے کیونکہ مقصود اعلیٰ (۱) نجات اکمل ہی ہے اور وہ بدوں گناہوں سے بچے حاصل نہیں ہوسکتی مگر بدعت سے بہت زیادہ اجتناب ضروری ہے کیونکہ بدعت حق تعالیٰ شانہ کو بہت مبغوض (۲) ہے۔

اس لئے کہ دیگر اعمال تو لوگ حرام اور گناہ سمجھ کر کرتے ہیں اور افعال بدعت کو نیکی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سے توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ ان ہی میں سے منکرات متعلقہ رسم مولد (۳) بھی ہیں۔

یہاں تک تو پہلا مضمون تھا جس کا ہمیشہ بیان کرنے کا معمول ہے۔ یعنی رسم میلاد کا جو کہ ختم ہو چکا۔ اس جزو کا نام الحبور لنور الصدور ہونا چاہئے کیونکہ جو نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صدور یعنی قلوب میں ہے اور وہ قیامت میں معلوم ہوگا، اور اس سے جنتوں میں خوشی حاصل ہوگی، یہ اس کا تذکرہ تھا۔

---

(۱) سب سے بڑا مقصود مکمل نجات ہے (۲) انتہائی ناپسند (۳) حضور ﷺ کی پیدائش پر کی جانے والی رسمیں۔

تبرکات نبویہ

اب دوسرا مضمون جو بعد میں منضم(۱) ہوا ہے یعنی تبرکات نبوی کا بھی جو کہ ربیع الاول کے متعلق ہے اور گیارھویں کا بیان بھی، جو کہ ربیع الثانی کے متعلق ہے شروع کرتا ہوں لوگوں سے ان دونوں میں زیادتی ہورہی ہے۔ میں ہر ایک کو الگ الگ بیان کردوں گا۔

تبرکات نبویؐ میں ایک تو وہی زیادتی ہورہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے۔ اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک کہ بعض طلباء بھی شک میں ہیں یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ جبہ نبویؐ کی زیارت باعث برکت ہے اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

مجھ سے ایک طالبعلم نے جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس ان کی دکان ہے۔ سوال کیا کہ میں دوکان میں بیٹھ کر جبہ کی زیارت کرلوں گا، مگر میں نے اسکی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ مجمع بالکل میلوں عرسوں کی طرح ہوتا ہے۔ تاریخ کی تعیین ہوتی ہے، دعوت ہوتی ہے، دور سے آدمی آتے ہیں۔ عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے زیارت کرنے آتے ہیں حالانکہ زیارتِ جبہ نماز روزہ کے برابر کبھی نہیں ہوسکتی۔

حدیث لا تتخذوا قبری عیدا سے اس کی بھی نفی ہوگئی ہے، کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہوسکتی۔ گو اس میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مثل یوم ولادت وغیرہ کے اس میں بھی تبدل(۲) ہوگیا۔ اگرچہ عدم تبدل کا یقین بھی

(۱) بعد میں ملایا گیا (۲) تبدیلی واقع ہوگئی۔

نہیں مگر خیر جو بات دل میں نہیں اسکو زبان پر بھی نہ لانا چاہئے۔ مگر ایک دوسری بات مابہ الامتیاز(۱) یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسد اطہر سے مماس(۲) نہیں اور قبر شریف کو مماس(۳) حاصل ہے۔ اسی لئے جبہ نبوی کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کہا۔ پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا؟

کہیں کہیں حضور ﷺ کے موئے مبارک(۴) اس وقت تک موجود ہیں عید بنانا ان کا بھی جائز نہیں کیونکہ اگر چہ بظاہر یہ خیال کر کے کہ موئے مبارک جزو بدن(۵) ہے، قبر سے افضل معلوم ہوتا ہے۔ مگر قبر میں اتصال اور مماس(۶) کی ایسی فضیلت موجود ہے جو موئے مبارک کو بالفعل(۷) حاصل نہیں۔ اس لئے دونوں خیر مساوی ہوئے، موئے مبارک جزو ہے مگر اب مماس نہیں، اور قبر شریف جزو نہیں مگر مماس ہے، تو دونوں برابر ہوئے اور ایک مساوی سے دوسرے مساوی کا حکم معلوم ہوتا ہے پس حدیث لا تتخذوا قبری عیدا سے موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہوگیا۔ یہ حضور ﷺ کی غایت بلاغت ہے کہ آپؐ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا جس سے ملبوس و شعر وغیرہ(۸) سب کے احکام خود بخود معلوم ہو گئے۔

علاوہ ازیں صحابہ اور سلف صالحین نے تعید(۹) کو کبھی اختیار نہیں کیا حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکات نبویہ موجود تھے۔ اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی۔ اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی۔

---

(۱) قبر شریف اور جبہ میں فرق کرنے والی ایک بات یہاں بھی موجود ہے (۲) وہ لباس جسم مبارک سے ملا ہوا نہیں (۳) اور قبر شریف ملی ہوئی ہے (۴) بال مبارک (۵) جسم کا حصہ (۶) آپ کے جسم سے لگے ہوئے اور متصل ہونے کی فضیلت (۷) جو بال کو عملاً حاصل نہیں (۸) جس سے لباس اور بالوں وغیرہ (۹) عید بنانے کو۔

تبرکات نبویؐ کے ساتھ صحابہؓ کا عمل

اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ صحابہ میں عید کی طرح اجتماع نہ تھا تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ تو اس کے لئے میں نے چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں۔ کیونکہ ان کو بلفظہا یاد رکھنا دشوار (۱) تھا اس وقت ان کو نقل کیے دیتا ہوں۔

عن عثمان بن عبد اللہ بن وھب قال فارسلنی اہلی الی ام سلمة بقدح من ماء و کان اذا اصاب الانسان عین اوشئی بعث الیھا محضحضة لھا فاخرجت من شعر رسول اللہ ﷺ و کانت تفسکه فی جلجل من فضة فحضحضته فشرب عنه قال فاطلعت فی الجلجل فرأیت شعرات حمراء رواہ البخاری۔

عثمان بن عبداللہ بن وہب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المومنین سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دے کر بھیجا۔ اور یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہوتی تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا۔ ان کے پاس حضور ﷺ کے کچھ بال تھے جن کو انہوں نے چاندی کی نلکی میں رکھا ہوا تھا۔ پانی میں ان بالوں کو ہلا دیا کرتی تھیں۔ اور وہ پانی بیمار کو پلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر نلکی کو دیکھا تو اس میں چند سرخ بال تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ایک صحابیہؓ کے پاس نلکی میں بال رکھے ہوئے تھے جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جاتا تھا کہ بیماروں کی شفاء کیلئے اسکا نسالہ (۲)

(۱) ان کو بعینہ الفاظ کیساتھ یاد رکھنا مشکل تھا (۲) اسکا دھون۔

پلا دیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ کے خضاب کے بارہ میں اختلاف ہوا ہے صحیح یہ ہے کہ حضور کے بال پکنے لگے تھے جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شبہ ہوتا تھا ورنہ حضور ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ کیونکہ حضور ﷺ کے کل سفید بال بیس کے قریب تھے یا کچھ زائد۔

نلکی پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کہ ایک تھانیدار کے یہاں ایک شخص نے رپٹ لکھوائی کہ میری فاتحہ چوری ہوگئی۔ داروغہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا اللہ فاتحہ کیا اور اسکا چوری ہونا کیسا؟ پوچھا! تو قصہ بیان کیا کہ ہمارا ایک پیر ہے جب وہ آیا کرے(۱) ہے، تو ہمارے کھانے کی فاتحہ(۲) دیا کرے ہے اور جب جاوے(۳) ہے ایک نلکی میں فاتحہ بند کر دے ہے، کہ سال بھر تک اس سے کام لیتے رہیو۔ پھر میں دوبارہ آ کر پڑھ دوں گا۔ تو نلکی چوری ہوگئی ہے۔

عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالی عنهما انها اخرجت جبة طیالسیة کسروانیة لهالینة دیباج وفرجیها مکفوفین بالدیباج کانت عند عائشه فلما قبضت قبضتها وکان النبی ﷺ یلبسها نحن نغسلها للمرضی تستشفی بها۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک جبہ طیلسانی کسروی نکالا، جس کے گریبان اور دونوں چاک پر ریشم کی عجاف لگی ہوئی تھی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد میں نے اسے لے لیا۔ حضور ﷺ اس کو پہنا کرتے تھے۔ ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ

(۱) آتا ہے (۲) دیا کرتا ہے (۳) جاتا ہے

پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفاء حاصل کرنے کیلئے۔

اس حدیث پر شاید بادی النظر(۱) میں کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ جبہ حضرت عائشہ اور حضرت اسماء کے پاس کیونکر رہا اور جب تک ترکہ نبوی تقسیم نہ ہو جائے ان کو اس کے استعمال کا کیا حق تھا؟

تو بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کے مال میں میراث جاری نہیں ہوگی۔ بلکہ آپؐ کے مال میں تمام مسلمانوں کا حق تھا۔ تو آپؐ کا ترکہ وقف تھا، اور یہ حضرات اسکے متولی تھے اور ان کے اذن(۲) سے سب مسلمانوں کو بطریق برکت اسکے استعمال کا حق حاصل ہے۔ اور اذن متولی(۳) کی قید اس لئے بڑھادی کہ شاید کسی کو یہ سن کر کہ حضور ﷺ کا مال وقف ہے اس جبہ متعارفہ کے لینے کی فکر ہوئی ہو۔ سو یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ حضور ﷺ کا ترکہ وقف ہے مگر وقف میں بدوں اذن متولی(۴) کسی کو تصرف کرنا جائز نہیں۔ پس جبہ شریف کو اس کے خدام سے چھیننا یا بلا اجازت استعمال کرنا کسی کو جائز نہیں، اور اس قسم کی باتوں کی ضرورت ہی کیا پڑتی ہے؟ وہ خدام تو بیچارے خود ہی اپنے سر پر رکھ کر ہر شخص کے گھر لے جا کر زیارت کرا دیتے ہیں۔ البتہ روٹی ان لوگوں کو دینا پڑے گی اس سے زیادہ وہ تم سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ یہ بھی جبہ شریف کی برکت کھلی ہوئی ہے کہ اس کے خدام بے طمع(۵) ہیں۔

خواب بابت جبہ شریف

احقر نے ایک بار یہ دیکھا کہ کوئی شخص اس کے چرانے کی فکر میں ہے۔ میں

(۱) سرسری نظر میں (۲) ان کی اجازت سے (۳) متولی کی اجازت کی قید (۴) بغیر متولی کی اجازت کے (۵) لالچی نہیں۔

نے خدام سے کہلا بھیجا کہ گو میرا خواب کوئی چیز نہیں مگر احتیاط کا مقتضا یہ ہے کہ جبہ شریف کی زیادہ حفاظت کی جائے۔

دنیا میں آپؐ کے موئے مبارک کا وجود

وعن انس قال ان النبیﷺ اتی منی فاتی الجمرة فرماها ثم اتی منزله بمنی ونحر نسکه ثم دعا بالحلاق وناول الحالق شقه الایمن فحلقه ثم دعا ابا طلحة الانصاری فاعطاه ایاه ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقه فاعطاه ابا طلحته فقال اقسمه بین الناس۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا۔ پھر حلاق(۱) بلایا اور اس کو سر کا داہنا حصہ اول دیا، اس نے داہنے حصہ کو مونڈا، پھر حضورؐ نے ابوطلحہؓ انصاری کو بلایا وہ بال ان کو عطاء کیے، پھر نائی کو سر کا بایاں حصہ دیا اور فرمایا مونڈو، اس نے بایاں حصہ کو بھی مونڈا۔ آپؐ نے وہ بال بھی ابوطلحہؓ انصاری کو دیے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کردو۔

یہاں سے ایک بات پر متنبہ کردینا مناسب ہے۔ وہ یہ کہ نائی کو آج کل حجام کہتے ہیں یہ لفظ غلط ہے۔ حجام اصل میں پچھنے(۲) لگانیوالے کو کہا جاتا ہے۔ نائی کو عربی میں حلاق کہتے ہیں مگر ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں یہ قوم پچھنے لگانے کا پیشہ بھی کرتی ہو۔

---

(۱) سر مونڈنے والا نائی (۲) جسم میں سے فاسد خون نکالنے کیلئے پہلے زمانے میں سر میں استرے سے نک لگوا کر خون نکالا جاتا تھا اس کو پچھنے لگانا کہتے ہیں اور یہ کام کرنے والے کو حجام کہتے ہیں۔

اس وجہ سے اسوقت اس کام کی مناسبت سے حجام لقب پڑ گیا ہوگا پھر اس پیشہ کے چھوڑ دینے کے بعد بھی لقب باقی رہا۔

ایک شاعر نے حجام کو خوب دھمکایا ہے کہ تو بڑا بے ادب ہے، خط پروردگار میں اصلاح کر دیتا ہے۔ یعنی داڑھی وغیرہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں تو ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ تو خط پروردگار کو درست کرتا ہے۔ یہ شاعر بھی کسی کو نہیں چھوڑتے، شعر یہ ہے۔

حجام ہر دو دست ترا قطع واجب است

اصلاح میدہی خطِ پروردگار را(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے بہت مقدار میں اپنے موئے مبارک صحابہ کرامؓ میں تقسیم فرمائے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ شرقا وغربا(۲) منتشر ہوئے تھے۔ تو اگر کہیں موئے مبارک پایا جائے تو جلدی سے انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تو اس کی تعظیم کی جائے ورنہ اگر یقینی دلیل افتراء و اختراع(۳) کی نہ ہو تو سکوت(۴) کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب۔ مشتبہ امر میں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

تبرکات نبوی کی تصدیق اور تکذیب میں احتیاط

قال علیہ السلام لا تصدقوا اہل الکتب ولا تکذبوھم

---

(۱) اے حجام تیرے دونوں ہاتھ کاٹنا واجب ہے اس لئے کہ تو خدا کی پیدا کی ہوئی چیز (یعنی داڑھی) میں اصلاح کرتا ہے (۲) مشرق ومغرب میں پھیل گئے (۳) جھوٹ اور من گھڑت ہونے کی پختہ دلیل نہ ہو (۴) خاموشی اختیار کی جائے۔

وقولوا امنا باللہ وما انزل الینا رواہ البخاری قال فی المرقاۃ فیہ اشارۃ الی التوقف فیما استشکل من الامور والعلوم

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو۔ بلکہ کہو کہ ہم اللہ پر اور اسکی کتاب پر جو کہ ہماری طرف نازل ہوئی ایمان لاتے ہیں۔

ملا علی قاری مرقاۃ میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر اشارہ ہے کہ جو امر اور جو مضمون علمی مشتبہ ہو اس میں توقف کرنا چاہئے۔ جرأت کر کے ایک جانب کو بلا تیقن معین نہ کرنا چاہئے۔ اہل کتاب کے اقوال میں توقف اس لئے واجب ہے کہ قرآن سے تورات وانجیل کا کتاب اللہ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اس میں تحریف بھی کی ہے۔ اب جو مضمون وہ بیان کریں اس میں یہ بھی شبہ ہے کہ کلام الٰہی ہو اور یہ بھی خدشہ ہے کہ اہل کتاب کے محرفات(۱) میں سے ہو۔ پس بلا دلیل مستقل کسی ایک جانب کی تعیین دشوار(۲) ہے اس لئے توقف واجب(۳) ہے۔

یہی حال موئے مبارک کا ہے کہ حضورؐ نے بہت سے بال صحابہؓ کو تقسیم فرمائے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حضورؐ کا بال جہاں بھی ہوگا اس کی حفاظت کی گئی ہے۔ اسلئے عقل بھی تقاضا کرتی ہے کہ اس میں سے کچھ بقایا ضرور موجود ہوں گے۔ مگر آج کل جھوٹ کا بھی بازار گرم ہے، یہ بھی شبہ ہے کہ طمع دنیا(۴) سے کہیں جھوٹ موٹ دعوی نہ کیا گیا ہو، اس لئے اسکے بارہ میں بھی توقف واجب ہے۔ نہ تصدیق کی جائے

(۱) اہل کتاب کی بدلی ہوئی باتوں میں سے کوئی ہو (۲) مشکل ہے (۳) اس لئے خاموشی بہتر ہے (۴) دنیا کے لالچ سے۔

نہ تکذیب(۱) مگر سنا ہے کہ مدینہ میں موئے مبارک بسند معتبر(۲) موجود ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موئے مبارک کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے موئے مبارک پایا نہیں مگر اتنی خبر سنی ہے کہ دنیا میں موجود ہے۔ سو تسلی کیلئے ہمیں اتنا بھی کافی ہے۔ پھر اس پر یہ شعر فرماتے ہیں۔

مرا از زلف تو موئے پسند است

ہوس را راہ مدہ بوئے پسند است(۳)

شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اشعار خوب موقع سے لاتے ہیں۔ ایک مقام پر جہاں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کا حال آیا ہے، کہ ایک دن حضورؐ نے حجرہ شریف کا پردہ اٹھا کر صحابہؓ کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ اور آپ مسرور(۴) ہوئے۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا چہرہ مبارک دیکھ کر قریب تھا کہ ہم نمازیں توڑ دیں کہ حضور نے اشارہ سے سب کو سکون کا حکم فرمایا۔ اس جگہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شعر بہت اچھا لکھا ہے۔

در نماز خم ابروئے تو چوں یاد آمد

حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد(۵)

برکات تبرکات

وعن ام عطیہ فی قصۃ غسل زینب بنت رسول اللہ

---

(۱) نہ سچا سمجھے نہ جھوٹا (۲) صحیح سند سے (۳) مجھے آپ کی زلف کا ایک بال بھی پسند ہے۔ ہوس کو اس باب میں گنجائش نہ دے، یہ پسندیدہ خوشبو ہے (۴) خوش ہوئے (۵) عین نماز کی حالت میں جب آپؐ کے چہرہ منور کا خیال آجاتا ہے میری حالت بگڑ جاتی ہے کیونکہ مسجد کی محراب کا خم دیکھ کر آپؐ کی ابرو کا خم یاد آجاتا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم وتکفینھا انھا قالت فالقی حقوہ فقال اشعرنھا ایاہ قال الشیخ فی اللمعات وھذا الحدیث اصل فی البرکۃ باثار صالحین ولباسھم

حضرت ام عطیہؓ حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل و کفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنا تہہ بند ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مرحومہ کے بدن سے مماس کر کے پہناؤ۔ یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو (تاکہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے)

حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ لمعات شرح مشکوۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار وملبوساتِ صلاحین سے برکت لینے میں اصل ہے۔ معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جاوے۔ مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی، نجاست قرآن کو بھی لگے گی۔ اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں ہیں اور اللہ رسول کا نام جا بجا ہے قابل احترم بلکہ الفاظ وحروف مطلقاً قابل احترام ہیں بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آلہ علم ہونے کے قابل احترام ہے۔

جہلاء کی بے اعتدالیاں

بعض لوگ فرعون وہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں یہ بالکل لغو و مہمل حرکت ہے۔ اُس پر تو بس نہ چلا الفاظ ہی کی بے حرمتی پر بہادری دکھلائی۔ یہ

لوگ وہ تھے جو فرعون کے لفظ کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ان کے مقابل بعض لوگ وہ ہیں جو اس لفظ کی ایسی حرمت(۱) کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے احسان وانعام کے تذکرہ کا ایک صنعت(۲) سے اس کو عنوان بناتے ہیں۔ چنانچہ مثنوی کے ایک محشی(۳) نے موسیٰ علیہ السلام کی فتح کے قصہ کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے۔ بفرعون الٰہی فرعون بدریائے نیل غرق شدہ (۴)۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ فرعون الٰہی یہ ترکیب کتنی فصیح ہے مگر مقصود تو یہ تھا کہ فرعون کے قصہ میں خدا کی مدد کا بیان بھی اسی کے نام سے ہوا۔ استغفر اللہ العظیم! یہ سخت واہیات ہے۔

اسی طرح آجکل یہ دستور(۵) شائع ہوگیا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے احسانات و انعامات کا عنوان پیر کے نام سے قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے مریدین اپنے اوپر فضل واحسان خداوندی کے تذکرہ کریں گے تو سارے الفاظ چھوڑ کر یوں لکھیں گے کہ بفضل رحمان۔

اسی طرح ہمارے سلسلہ میں بعض لوگ خطوط میں بامداد اللہ لکھتے ہیں مجھے تو اس سے سخت نفرت ہے اور اس میں شرک کی بو آتی ہے۔ اب تو صرف یہ عادت ہے مگر یاد رکھو کہ چند روز کے بعد عبادت ہو جائیگی۔

مرید کو اپنی کوئی چیز بطور تبرک دینے کا حکم

غرض اس حدیث سے تبرکات وغیرہ کا قبر میں رکھنا جائز معلوم ہوا کیونکہ حضورؐ نے اپنا ملبوس شریف تبرکاً کفن میں رکھنے کیلئے عطا فرمایا ہے۔ مگر ہم کو تبرک کی

---

(۱) احترام (۲) ایک انداز سے (۳) حاشیہ لکھنے والے نے (۴) اللہ کی بڑائی اور مدد کی وجہ سے فرعون دریائے نیل میں غرق ہو۔ اس جملہ میں پہلے فرعون سے مراد بڑائی اور دوسرے فرعون سے فرعون موسیٰ مراد ہے۔ (۵) یہ دستور عام ہوگیا ہے۔

نیت سے کسی کو کوئی چیز اپنا ملبوس وغیرہ دینا جائز نہیں۔ کیونکہ حضورؐ نبی تھے اور اپنی برکت کو آپؐ وحی سے جانتے تھے۔ ہمارے اوپر کونسی وحی اتری ہے کہ ہم بھی بزرگ اور صاحب برکت ہیں۔ خاتمہ ایمان پر ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔

میں نے ایک بار ایسی نادانی کی کہ حضور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ اپنے کچھ حالات بطور سوانح لکھوا دیجئے۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا خوب اپنے ہی منہ میاں مٹھو بنوں۔ واقعی اپنے کو بزرگ سمجھنا کیسے ہوسکتا ہے اور تبرک ہوتا ہے بزرگوں کا پس اپنا تبرک کیسے دیا جائے۔

یہاں پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مشائخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بعض دفعہ خود بخود بدوں درخواست کے اپنے متعلقین کو اپنے تبرکات دیے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات تبرکاً نہیں دیتے تھے بلکہ مرید کا جی خوش کرنے کیلئے دیتے تھے، کہ مرید کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیخ کی میرے حال پر توجہ بہت ہے۔ یا اس خیال سے دیتے ہیں کہ لینے والے کو اس میں برکت کا گمان ہوگا تو اس کو اس خیال سے نفع ہوگا۔ چنانچہ واقعی نفع ہوتا ہے۔ ایک نفع تو میں نے خود محسوس کیا ہے۔

کیرانہ میں ایک گوجر تھے حاجی عبداللہ بڑے بزرگ آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے ایک چھینٹ کا جبہ دیا تھا جس کا یہ اثر تھا کہ جب تک میں اسے پہنا رہتا تھا معاصی کا خیال نہ آتا تھا بلکہ معاصی (۱) سے نفرت رہتی تھے۔

شاید پیروں کے کوئی معتقد یہ سوال کریں کہ شیخ کے تبرک کو پہن کر پائخانہ میں جانا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب یہ ہے کہ جائز ہے، البتہ اگر غلبۂ ادب ہو تو واجب بھی نہیں اور ہر

(۱) گناہوں سے۔

جائز کام کا کرنا ضروری ہی کیا ہے۔

جبہ مبارک کے بارے میں حضرت تھانویؒ کا ادب

خود میری یہ حالت ہے کہ جب جبہ شریف تھانہ بھون میں آتا ہے تو اگر چہ اس مکان کی طرف جہاں وہ رکھا جاتا ہے، پیر کرنا جائز ہے۔ مگر غلبۂ ادب کی وجہ سے مجھ سے اس طرف پیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب کچھ ہے مگر اس سے احکام نہیں بدل سکتے۔ حکم شرعی وہی ہے کہ پیر کرنا اسکی طرف جائز ہے اور تبرکات کو پہن کر پائخانہ میں جانا جائز ہے۔ اور یوں کسی کو غلبہ ادب ہو وہ ایسا نہ کرے۔ مگر حکم یہی ہے شرعی حکم کے سامنے نہ الہام کوئی چیز ہے اور نہ خواب وکشف کچھ ہے۔

اہمیت احکام شرعیہ

شاہ نظام الدین اولیاء وقاضی ضیاء الدین سنامی رحمۃ اللہ علیہما کا قصہ ہے کہ حضرت سلطان جی سماع سنا کرتے تھے اور قاضی صاحب ان کو روکتے تھے۔ حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں کہ میں حق پر ہوں جب بھی مانو گے۔ تو انہوں نے کہا کہ اچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادو۔ حضرت سلطان جی نے اپنی چادر اتار کر ان کو اڑھادی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ دربار رسالت قائم ہے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مجمع ہے۔ حضور ﷺ ان میں تشریف فرما ہیں اور ارشاد فرمارہے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ قاضی صاحب نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اس وقت مجھے معلوم نہیں کہ میں کس حال میں ہوں، ہوش میں ہوں یا بیہوش ہوں۔ ایسی حالت کا سنا ہوا حکم معتبر نہیں ہوسکتا۔ حکم

وہی ہوگا جو کہ حضور ﷺ ہوش وحواس کی حالت میں صحابہؓ نے نقل فرمایا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے تبسم فرمایا حضرت سلطان جی نے چادر اتار لی اور کہا دیکھا بھی حضور نے کیا فرمایا۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ سنا بھی ہم نے کیا عرض کیا۔

تو صاحبو! شرعت کے احکام کے سامنے تو حضور ﷺ کی زیارت منامیہ کے وقت کی سنی ہوئی باتیں بھی حجت نہ ہوں گی۔ کیونہ احکام شرعیہ حضور سے اس طرح منقول ہیں جن میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں، اور خواب یا کشف کی زیارت میں غلطی کا احتمال ہے۔

احترام تبرکات

عن کبشه قالت دخل علی رسول الله صلی الله علیه وسلم فشرب من ماء فی قربة معلقة قائما فقمت الی فیها فقطعتها

حضرت کبشہ صحابیہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر تشریف لائے اور ایک لٹکے ہوئے مشکیزہ سے منہ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا۔ میں کھڑی ہوئی اور دہانہ مشک کو کاٹ کر تبرکا اپنے پاس رکھ لیا۔

قال القاضی عیاض رحمة الله علیه فی الشفاء ومن اعظامه صلی الله علیه وسلم اعظام جمیع اسبابه واکرام مشاهده واماکنته من مکة والمدینه ومعاهده وملامسة علیه الصلوة والسلام وایضا قال کانت فی قلنسوة خالدبن الولید شعرات من شعره صلی الله علیه وسلم فسقطت قلنسوته فی

بعض حربه فشد عليها شدة انكر عليه الصحابة لكثرة من قتل فقال لم افعلها بسبب القلنسوة بل لما تضمنت من شعر النبى صلى الله عليه وسلم لئلا اسلب بركتها وتقع فى ايدى المشركين.....الخ

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ شفاء(۱) میں لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کی تعظیم میں سے یہ بھی ہے کہ حضورؐ کے تمام متعلقات کی تعظیم کی جائے اور جس جگہ آپؐ تشریف لے گئے ہیں اسکا احترام کیا جاوے۔ اور مکہ مدینہ میں جن مکانات کو حضورؐ سے کسی قسم کا انتساب ہے انکا احترام کیا جائے، ویسے ہی جن چیزوں کو آپؐ نے لمس(۲) کیا ہے۔ نیز شفاء میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ بعض لڑائیوں میں ان کی کلاہ(۳) سر پر سے گر پڑی تو اس کیلئے انہوں نے ایسا سخت حملہ کیا جو ان کے ساتھیوں کو غیر معمولی معلوم ہوا کیونکہ اس حملہ میں بہت آدمی قتل ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے یہ حملہ ٹوپی کی وجہ سے نہیں کیا تھا بلکہ اس میں حضور ﷺ کے موئے مبارک تھے اس کی وجہ سے کیا تھا، کہ مبادا کہیں میں ان کی برکت سے محروم نہ ہو جاؤں اور یہ مبارک بال کفار کے ہاتھ میں پہنچ جائیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ ہے کہ چند کھجوریں حضور نے انکو دم کر کے دی تھیں۔ جن کو انہوں نے ایک توشہ میں رکھ لیا تھا۔ اور ان میں ایسی برکت ہوئی کہ ہمیشہ ان میں سے کھاتے رہے یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کے واقعہ شہادت میں وہ انکے پاس سے کھوئی گئیں، جس کا انکو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ ان کا شعر بھی اس بارہ

(۱) کتاب کا نام (۲) چھوا ہے (۳) پگڑی۔

میں مشہور ہے۔

للناس هم وفی الیوم لی همان

فقد الجراب وقتل الشیخ عثمان

کہ لوگوں کو ایک ہی غم ہے اور مجھے آج دو غم ہیں۔ توشہ دان کے کھوئے جانے کا اور حضرت عثمانؓ کے شہید ہونے کا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو اس برکت نبویؐ کے فوت ہو جانے کا غم تھا جو اُن چھواروں میں تھی۔ عشاق کی یہی حالت ہوتی ہے کہ محبوب کی ذرا ذرا سی چیز پر جان دیتے ہیں۔

در منزلے کہ جاناں روزے رسیدہ باشد

با خاکِ آستانش داریم مرحبائے(۱)

عشاق کو جنت بھی حضورؐ کی وجہ سے مطلوب ہے

عشاق کو تو اسی حُبِ منزلِ محبوب کی بنا پر جنت کی بھی تمنا اسی طمع و اشتیاق میں ہوگی کہ وہاں جنت میں حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوں گے۔ جنت میں گو راحت تو انشاء اللہ ملے ہی گی مگر عشاق کو جنت کی اصل تمنا اور آرزو زیادہ اسی لئے ہوتی ہے کہ وہاں حضور ﷺ کی زیارت ہوگی تو گویا جنت بھی آپؐ ہی کی ذات بابرکت سے مقصود ہوگئی۔ اور جنت تو جنت آپ کی تو یہ شان ہے کہ دنیا میں بھی جس حصہ زمین پر آپ ہوں وہ مقصود ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

لا اقسم بهذا البلد☆ وانت حل بهذا البلد(۲)

(۱) کسی گھر میں میرا محبوب جس دن آجائے تو میں اس کی مٹی کو بھی اس روز مبارک مبارک کہوں (۲) سورۃ البلد آیت ۱،۲

اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے واؤ حالیہ قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اس حال میں کہ آپ اس میں مقیم ہیں'' یعنی آپ کی اقامت کی وجہ سے یہ شہر اس درجہ مکرم ہوگیا کہ خدا تعالیٰ اس کی قسم کھاتے ہیں۔

پس اس بناء پر کہ جب جنت میں داخل ہوجاؤ گے تو ایک خوشی تو ہوگی راحت ملنے کی اور غم کے زائل ہونے کی کہ اللہ کا شکر ہے دنیا کے مصائب سے نجات ہوگئی۔ چنانچہ حق تعالیٰ جنتیوں کا قول نقل فرماتے ہیں کہ اہل جنت کہیں گے۔

الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن ان ربنا لغفور شكور☆ الذی احلنا دار المقامة من فضله لا يمسنا فيها نصب ولا يمسنا فيها لغوب☆(۱)

یعنی حمد وشکر کرتے ہیں ہم اللہ کا جس نے ہم سے غم دور کردیا۔ بے شک خدا تعالیٰ بڑے بخشنے والے بہت قدردان ہیں، جنہوں نے اپنے فضل سے اقامت کی جگہ میں پہنچادیا (یعنی جنت مثل دنیا کے دارالارتحال نہیں بلکہ دارالاقامہ(۲) ہے) نہ ہمیں اس میں مشقت پہنچتی ہے نہ تھکن۔

یہ خوشی تو طبعی ہوگی۔ دوسری خوشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہوگی اور یہ خوشی عشقی ہوگی۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ کے ضمن میں تبریز کا ذکر فرماتے ہوئے مولانا شمس تبریز کو یاد کرکے تبریز کے حق میں کہتے ہیں۔

ابر کی یا ناقتی طالب الامور

ان تبریزا مناجات الصدور

(۱) سورۃ الفاطر آیت ۳۴، ۳۵ (۲) کوچ کرنے کی جگہ نہیں بلکہ ہمیشہ رہنے کا مقام ہے

اسرحی یا ناقتی حول الریاض

ان تبریز النعام نعم المفاض

سار بانا بار بکشاز اشتراں

شہر تبریز ست و کوئے گلستان(۱)

یہ اشعار زبان حال سے جنت میں جانے کے وقت پڑھنے کے قابل ہوں گے پس ''ابرکی'' اور ''اسرحی یاناقتی'' جب جنت میں پڑھیں گے تو وہاں ناقہ سے مراد جسم ہوگا یعنی اے بدن ٹھہر جا اور خوب کھا پی۔ اب تعب نہیں رہا۔ مشقت کے دن گئے اب تبریز حقیقی آگیا تو یہ جسم اونٹنی ہے جو روح کا مرکب ہے اور اس پر سوا ہو کر ہم اعمال کرتے ہیں۔ اور اس مرکب ہونے کے لحاظ سے یہ اعضاء بھی قابل قدر ہیں کہ اعمال صالحہ کا ذریعہ ہیں۔ عارفین کو اپنے بدن کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ اسی وجہ سے ہوتی ہے ایک عارف کہتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است

افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را

کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است(۲)

یعنی محبوب تک رسائی ہونے میں چونکہ ان کو دخل ہے اس وجہ سے یہ رتبہ ان اعضاء کا ہوگیا کہ یہ قابل بوسہ کے ہیں اور باعث ناز ہیں اور جب اس تعلق سے قطع

---

(۱) (۲) اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھتی ہیں اپنے پاؤں پر فدا ہوں کہ تیرے کوچے میں پہنچاتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کو ہر وقت ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ تیرے دامن کو میری جانب کھینچتے ہیں۔

نظر کرلی جائے تو اس حالت میں یہ اس کے مصداق ہیں جو دوسرے صاحب حال کہتے ہیں۔

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشمِ روشنِ خود
کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے (۱)

یا جیسے حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن نہ دہم (۲)

یعنی میری نظر ہونے کے لحاظ سے یہ بھی غیر ہے اور قابل غیرت ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ کا عطیہ ہے قابل قدر و باعث فخر ہے چنانچہ اس کے بعد ہی بینم (۳) کا مقصود ہونا، اسی اعتبار سے فرماتے ہیں۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد
تا نہ بینم رخِ تو روح رمیدن نہ دہم (۴)

پس ناقہ بدن کہ من حیث آلۃ الوصول گویا جنتی بلسان حال خطاب کرتا ہے۔ ''ابرکی یا ناقتی'' اور ''اسرجی یا ناقتی'' (۵) اور عجیب بات ہے کہ اشعار میں بھی حول

(۱) خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ آپ کے حسین چہرے کی طرف بلا حائل دیکھتی ہیں (۲) تجھے دیکھنے کیلئے مجھے آنکھ کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کہ اصل میں تیرا غیر ہے اسلئے مجھے غیرت آتی ہے یہ اصل میں وہ تجھے دیکھنے میں ایک طرح کا حائل ہے اسی طرح کان بھی تیری بات سننے نہیں دیتے (۳) دیکھنے کی قوت کے مقصود ہونے کو بیان کرتے ہیں کہ آنکھ کا اصل مقصد دیدار حق ہے (۴) اگر ملک موت میرے پاس آکر کہے کہ جان سپرد کر دو تو میں جب تک تیرا دیدار نہ کرلوں جان سپرد نہ کروں (۵) پس اس جسم کو جو اونٹنی کے ہے کہ اس پر روح سوار ہے اور وہ بھی وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے جنتی زبان حال سے کہے گا مرے بدن نہر جا اور خوب کھا پی لے۔

الریاض آیا ہے، اور اس آیت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس میں بھی فی روضۃ وہی مادہ واقع ہے۔ پس یہ عجیب تطابق ہے۔ لفظاً بھی معنیً (۱) بھی۔ اور "فی روضة" کے بعد جو "یحبرون" آیا ہے۔ مضمون مقصود کا نام "الحبور" بھی اسی لئے رکھا گیا ہے۔ بہر حال جنت میں جانا "حبور" ہے تو جنت میں جانے کا سبب کہ حضور ﷺ کے قدوم واتباع کی برکت ہے اصل الحبور ہے۔

ایک تابعی کا غایت ادب

پھر بقیہ مضمون تبرکات کا معروض ہے

وایضا قال القاضی وحکی عن عبد الرحمن السلمی عن احمد بن فضلویه الذاهد وکان من عزة الرماة انه قال ما مسست القوس بیدی الا علی طهارة منذ بلغنی ان رسول اللهﷺ اخذ القوس بها

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تابعیؒ کی حکایت بیان فرمائی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے کمان کو اپنے دست مبارک میں لیا ہے اس وقت سے بے وضو کمان کو میں نے کبھی ہاتھ میں نہیں لیا۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے ادب کا کہ جس چیز کا ہاتھ میں لینا حضور سے ثابت ہو گیا اس کی مثل کو بھی بے وضو کبھی نہ چھوا۔ یہ تو سب کر سکتے ہیں کہ جس چیز کو حضور ﷺ خود مس فرمایا ہے اسکو بے وضو ہاتھ میں نہ لیا جاوے، مگر یہ بات کہ اس کی نوع میں سے بھی کسی کو بے وضو نہ چھوا جائے یہ غایت ادب ہے۔

(۱) یہ عجیب لفظی اور معنوی مطابقت ہے۔

ابن عمرؓ کا برکت حاصل کرنا

وایضاً قال القاضی عیاض رای بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ واضعایدہ علی مقعد النبیﷺ من المنبرثم وضعها علی جبهته۔

قاضی عیاض حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنا ہاتھ منبر نبویؐ پر پشت گاہ نبویؐ سے مس کر کے اپنی پیشانی کو ملتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ملبوس نبویؐ سے مس کی گئی ہو اس میں بھی برکت ہوتی ہے۔ مگر اس سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہیے۔ کیونکہ سمجھنے کی بات یہ کہ ان چیزوں کی قدر کس لیے ہے؟ اسی لئے کہ یہ حضور کی چیزیں ہیں۔ پھر احکام بھی تو حضور ہی کے ہیں ان کی بھی تو قدر کرنی چاہئے۔ ان میں بھی تو برکت ہے۔ اس برکت کو بھی تو لینا چاہئے۔ غرض وہ جو سوال کیا گیا تھا کہ سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہو گیا۔ ان ہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ تعدی(۱) نہ کرنی چاہئے۔

نذریں ماننا

بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جبہ شریفہ کیلئے نذریں مانتے ہیں۔ فقہاء نے اسکو حرام لکھا ہے کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کیلئے نہیں ہو سکتی۔ عبادت خالق جل وعلی شانہ(۲) کے لئے خاص ہے۔ بحر الرائق(۳) میں اس بات پر

---

(۱) اس سے زیادہ زیادتی (۲) عبادت صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے (۳) نام کتاب فقہ

اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کیلئے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے نہ وہ نذر منعقد ہوگی اور نہ اس کا پورا کرنا ذمہ میں واجب ہوگا۔ اور وہ حرام بلکہ سخت حرام ہے۔ مجاوروں کو اس کا لینا، کھانا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

فی البحر. النذر للمخلوق لا یجوز لانه عبادة والعبادة لا یکون للمخلوق وفیه الاجماع علی حرمة النذر للمخلوق ولا ینعقد ولا تشتغل الذمة منه وانه حرام بل سحت ولا یجوز للخادم و الشیخ اخذه ولا اکله ولا التصرف فیه بوجه من الوجوه(۱)

عرس وغیرہ کیلئے زمین وقف کرنا

بعض لوگ جبہ شریف کے عرس وغیرہ کیلئے زمینیں وقف کرتے ہیں تو یاد رکھئے اگر وقف کرنے والے کی نیت اس وقف سے یہی ہے کہ ان بدعات وخرافات میں اس کا روپیہ صرف کیا جائے، تب تو یہ وقف باطل ہے جائز نہیں، اور وقف کرنے والا گنہگار ہے۔ وفی العالمکیریة ومنها انی من شرائط صحته ان یکون قربة من ذاته وعند التصرف.....الخ۔

یعنی صحت وقف کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس کام کیلئے وقف کیا گیا ہے وہ فی نفسہ بھی قربت (۲) ہو۔ اور وقت تصرف کے بھی قربت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ عرس وغیرہ کا دلائل شرعیہ سے حرام ہونا معلوم ہے۔ تو اس کی نیت سے وقف بھی صحیح نہ ہوگا۔

---

(۱) بحر الرائق میں ہے مخلوق کیلئے نذر ماننا جائز نہیں اس لئے کہ یہ عبادت ہے، اور عبادت مخلوق کی نہیں کی جاتی اور مخلوق کیلئے نذر ماننے کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔ نہ وہ منعقد ہوگی نہ اس کے ذمہ اس کا پورا کرنا ہے اور یہ کہ وہ حرام ہے بلکہ اس سے روکا جائیگا۔ اور نہ خدام کو اس کا لینا اور کھانا اور اسمیں تصرف کرنا جائز ہے کسی بھی طرح (۲) اپنی ذات میں بھی ثواب کی بات ہو۔

اور نہ اس کیلئے چندہ دینا درست ہوگا۔ البتہ اگر اس نیت سے وقف کیا جائے کہ جو فقراء و مساکین اسکی زیارت کو حاضر ہوں ان پر صرف کیا جائے اور جو لوگ اس کے متولی ہوں وہ بھی بقدر حاجت اس میں سے لے لیا کریں تو یہ وقف صحیح ہے، اور اس نیت سے خدامِ جبہ کو کچھ بھی دینا جائز ہے۔

غرض جبہ شریف کیلئے نذریں ماننا بالکل حرام ہے اس سے مسلمانوں کو احتراز (۱) لازم ہے۔

ادب میں غلو کا نقصان

بعض لوگ نذر کے پیسے جبہ شریف کے اوپر لا کر رکھتے ہیں اور یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ گویا معاذ اللہ حضور ﷺ ان کو دست مبارک میں لیتے ہیں۔ استغفر اللہ العظیم! کیا یہ ناپاک چیزیں اسی قابل ہیں کہ جبہ شریف پر ان کو رکھا جائے اور یہ اعتقاد کیا جائے کہ حضور ان کو دست مبارک میں لیتے ہیں۔ واقعی جب ادب میں غلو ہوتا ہے تو بے ادبی ہونے لگتی ہے۔ اور کرنے والوں کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ ان کو ذرا بھی عقل نہیں آتی۔ بھلا یہ گندے پیسے جو چمار اور بھنگیوں کے ہاتھوں میں بھی جاتے ہیں جبہ شریف پر رکھنے کے قابل ہیں۔

سچ کہا کسی نے توقع زوالا اذا قیل تم ۔ کہ جب کوئی چیز کمال کو پہنچ جاتی ہے اب اس کے زوال کو توقع کرو کیونکہ کمال کے بعد آگے کوئی مرتبہ رہا نہیں۔ لامحالہ پیچھے کو لوٹیں گے۔ بالکل یہی حال ہو رہا ہے کہ ادب میں غلو کرتے کرتے اب بے ادبی کی طرف لوٹنے لگے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اعتدال سے ہر کام کرنا چاہئے اس مضمون کا پہلا جزو جو کہ تبرکات کے متعلق تھا، ختم ہوا۔

(۱) بچنا لازم ہے۔

گیارھویں کے احکام

اب دوسرا جزو کہ وہ بھی اسی مضمون کے متعلق ہے اور پھر دونوں جزو مل کر ایک ہیں۔ وہ بیان کرتا ہوں اور وہ جزو گیارھویں کے متعلق ہے۔ اس روز لوگ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارھویں مناتے ہیں۔ اول تو لا تتخذوا قبری عیداً سے اس کا بھی رد ہو گیا۔ کیونکہ مثل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل(۱) ہو گیا، جب غیر متبدل(۲) یعنی قبر نبوی کا عید بنانا حرام ہے تو متبدل یعنی بڑے پیر صاحب کی گیارھویں کا عید بنانا کیسے جائز ہوگا۔

دوسرے یہ تاریخ حضرت کی وفات کی کسی مؤرخ نے نہیں لکھی۔ نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہام سے معلوم کر لی۔ بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم خود حضور ﷺ کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اسکا ثبوت دینا چاہئے۔ دوسرے اگر ہو بھی تو کیا تم حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ ﷺ کے برابر کرتے ہو۔ کہ رسول اللہ کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو، یہ تو ان کے بھی خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ گیارہویں رسول کی کیا کرتے تھے تو اس کو ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسولؐ کے میری گیارہویں کی جائے۔

تیسرے اس میں عقیدہ بھی فاسد ہے کہ لوگ حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ ﷺ کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پیر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت غوث اعظم کا میلاد بھی ہونے لگا گویا بالکل ہی رسول کی مساوات(۳) ہو گئی، اور غضب(۴)

---

(۱) مثل پیدائش کے دن کے یہ دن بھی بدل گیا ہے (۲) جب ایسی چیز جو بدلی نہیں (۳) رسولؐ کی برابری (۴) افسوس یہ ہے کہ

یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل(۱) ہوگی۔ بڑے پیر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ اور پھر نامعلوم کیا کیا کر دیں گے۔ گویا نعوذ باللہ وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں۔ نیز گیارھویں کرنے کو مال واولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں اس میں حضرت غوث اعظم سے دنیا کیلئے تعلق رکھنا ہو۔ ایہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو چھوڑ کر وہ الگ ہو گئے تھے اسی کیلئے اس سے تعلق کیا جائے۔

غرض گیارہویں کے اندر بھی عملی اور اعتقادی بہت سی خرابیاں ہیں ان کو چھوڑنا چاہئے۔ اگر کسی کو حضرت غوث اعظم کے ساتھ محبت کا دعوی ہو تو کچھ قرآن پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دے یا بلا تعیین تاریخ وغیرہ غربا وغیرہ کو کھانا کھلا دے۔

وعظ کے نام کا تعین

اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں اور اس دوسرے حصہ وعظ کا نام ''الحضور لامور الصدور'' رکھتا ہوں۔ اسمیں صدور جمع ہے صدر کی جس کے معنی ہیں عظیم الشان چونکہ اس میں تبرکات کی زیارت وغیرہ کا ذکر ہے اس لئے یہ نام مناسب ہے۔ یہ تو ہر حصہ کا الگ الگ نام ہے پھر جی چاہتا ہے کہ مجموعہ کا نام بھی رکھ دیا جائے۔ تو مجموعہ کا نام ''راس الربیعین'' ہے۔ وجہ اس نام کی یہ ہے کہ جزو اول اس نام کا یعنی ''راس'' بمعنی طرف ہے، جس کا اطلاق کبھی طرف اول پر کبھی اخیر پر آتا ہے، اور آج کا دن ایک ماہ کا محتمل ختم اور دوسرے ماہ کا محتمل(۲) آغاز ہے۔ اور جزو ثانی کے معنی ظاہر ہیں۔ اور لطیفہ اس میں یہ بھی ہے کہ یہ نام اس سے پہلے والے وعظ کے نام کے بھی یعنی ''راس الربیعین'' کے مناسب ہے۔ اگر کوئی صاحب شائع کر دیں تو دونوں کو الگ الگ شائع نہ کریں کیونکہ میرا لطیفہ ربیعین کا ضائع

---

(۱) مصیبت آجائے گی۔ (۲) امکان ہے کہ ایک ماہ کا آخر ہو یا دوسرے کا شروع ہو کہ اس تاریخ میں احتمال ہے کہ ۳۰ ربیع الاول ہو یا یکم ربیع الثانی

ہو جائے گا۔

اس کے متعلق میں نے ایک خواب کانپور میں سنا تھا جب جامع مسجد کانپور کے وسیع کرنے کا خیال ہوا تو ایک مینار کو توڑنے کی رائے ہوئی تا کہ بیچ میں مینار واقع نہ ہو، بلکہ مسجد کو بڑا کر کے کنارہ میں نیا مینار تعمیر کیا جائے۔ تو ایک شخص نے رات کو خواب میں دیکھا کہ دونوں مینار گلے مل کر رو رہے ہیں۔ اللہ اکبر! جمادات میں بھی وہ انس کا مادہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ دونوں وعظ باہم متناسب (۱) اور موزوں ہیں اور قریب قریب ایک مضمون کے ہی ہیں اور ایک ہی وقت میں بیان ہوئے ہیں، اس لئے ان میں بھی جدائی نہ کی جائے اگرچہ شرعاً جائز ہے۔

خلاصہ وعظ

سب مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ بڑی خوشی حضور ﷺ کی تشریف آوری سے اس بات پر ہونی چاہئے کہ آپؐ کی برکت سے ہمیں ایمان اور اعمال کی توفیق ہوئی اور یہ خوشی جنت میں جا کر پوری طرح محسوس ہوگی جس کی آیت میں بشارت ہے۔

فاما الذين اٰمنوا وعملوا الصلحت فهم في روضة يحبرون (۲)

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین اس سال یہ مضمون ربیع الاول کے بالکل اخیر میں ہوا، جس میں منجانب اللہ یہ لطیفہ ہو گیا کہ وقت کا التزام نہ رہا۔ اور انشاء اللہ کبھی ایسا بھی ہوگا کہ اس کے متعلق بالکل ہی بیان نہ ہوگا تا کہ التزام کا بالکل وہم بھی نہ رہے۔

والحمد لله رب العالمين

(۱) ایک دوسرے کے مناسب (۲) سورۃ الروم آیت ۱۵۔

خلیل احمد تھانوی ۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ